

کے بعد کھانا کھائے بناء میں ہرگز کسی کو نہ جانے دوں گا۔ ناممکن۔۔۔۔۔ عبد اللہ انکساری سے گویا ہوا۔

”شا کر چچا۔۔۔۔۔ مغرب کے بعد تو بہت دیر ہو جائے گی۔ ہماری طرف کی سواری ملنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ اور پھر چچا۔“

”بھئی مولوی صاحب سے تو میں خود نمٹ لوں گا۔۔۔۔۔ وہ جانتے ہیں کہ میری اکلوتی بچی کی خوشی ہے، ایسے میں دیر سویر تو ہو ہی ہو جاتی ہے۔۔۔۔۔ رہی بات سواری کی۔۔۔۔۔ تو میں خود تم لوگوں کو واپس چھوڑ دوں گا۔۔۔۔۔ بس طے ہو گیا۔“

شا کر نے حتمی فیصلہ دے دیا۔ عبد اللہ کے پاس بھی مزید بحث کی اب کوئی گنجائش نہ تھی، اس نے شا کر سے مغرب کی نماز کے لیے اجازت چاہی اور قریبی مسجد کی طرف روانہ ہو گیا۔ شا کر نے اسے جلد واپس لوٹنے کی تاکید کی۔ پھر جیسے اچانک شا کر کو کچھ یاد آیا۔ اس نے زور سے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔

”ارے حماد بابا۔۔۔۔۔ دیکھو اب واقعی بوڑھا ہوتا جا رہا ہوں۔۔۔۔۔ اندر نگہت کی ای تمہیں بلاتی ہیں۔“۔۔۔۔۔ نگہت شا کر کی بیٹی کا نام تھا۔ بچپن میں میری ساری کتابیں سال ختم ہونے کے بعد نگہت کے پاس ہی جاتی تھیں۔ شا کر کو اپنی بیٹی کی تعلیم کی بڑی فکر لگی رہتی تھی۔ نگہت جب چھوٹی تھی تو وہ اپنے ابا کے ساتھ کبھی کبھی ہمارے گھر بھی آتی تھی۔ وہ خاموش سی چھوٹی بچی مجھے اب تک یاد تھی۔ شا کر کی بیوی کو بچپن سے خالہ کہتا تھا جس پر میری اصل خالائیں خاصی جزبر ہوتیں تھیں اور ان سے میں خاصا مانوس بھی تھا۔ جیسے آج کل سنی مولوی صاحب کے لیے گھر سے چھپ چھپ کر چیزیں لے جاتا تھا اسی طرح میں بچپن میں نگہت اور خالہ کے لیے اپنے اسکول بیک میں چاکلیٹس، کتابیں اور دیگر چیزیں لے جایا کرتا تھا۔ اسکول سے واپسی پر میں شا کر سے ضد کر کے چند لمحوں کے لیے پُرانی حویلی رکنا اور اپنے چھوٹے چھوٹے معصوم تحفے خالہ اور نگہت کو دے آتا۔ خالہ اس بات پر مجھ سے ہمیشہ ناراض بھی ہوتیں لیکن میرا یہ معمول تمام اسکول لائف میں جاری رہا۔۔۔۔۔ جب تک کہ مجھے بورڈنگ نہیں بھیج دیا گیا۔ البتہ بورڈنگ سے بھی جب میں چھٹیوں میں گھر واپس آتا تو اس خاندان سے ملنے ضرور جایا کرتا۔

میں جانتا تھا، خالہ شا کر سے میرے بارے میں ضرور پوچھیں گی اور مجھے اندر ضرور بلوائیں گی۔ لیکن جانے کیوں میں اس پل سے گھبرار ہاتا تھا، کترار ہاتا تھا۔ میں اس وقت اندر نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہاں سب ہوں گے۔ اور پھر سب نہ بھی ہوں تو کیا ہے وہ تو ہوگی۔ پتہ نہیں اس کے سامنے میں خالہ سے یا نگہت سے ڈھنگ سے بات بھی کر پاؤں گا یا نہیں۔ پہلے وہ یہاں آتے وقت گیٹ پر میری ہڑبڑاہٹ ضرور محسوس کر چکی ہوگی۔ لیکن بہر حال، اس وقت شا کر کوٹا لے کا یا انکار کرنے کا کوئی موقع بھی مجھے میسر نہ تھا۔ شا کر میرے سر پر ہی کھڑا تھا اور مجھے ساتھ لے کر ہی وہ وہاں سے ملتا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ میں تنہا کبھی بھی اندر نہیں جاؤں گا۔ شا کر کے ساتھ بھی میرا عجیب رشتہ تھا۔ میں نے کبھی اسے چچا، بابا یا کسی اور احترام کے نام سے پکارنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ جب کبھی مجھے اسے پکارنا ہی پڑ جاتا تو میں شا کر کے نام سے ہی پکارتا تھا۔ بچپن سے ہی میرا یہی معمول تھا۔ میں نے کبھی کسی روایتی طریقے سے اپنے دل میں موجود احترام کو ظاہر نہیں کیا تھا۔ شاید ہمارے بیچ موجود اس رشتے کو کسی روایتی نام یا احترام کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

شا کر مجھے لپٹے ہوئے اندر زنانے کی طرف بڑھ گیا۔ اندر سے عورتوں کے ہنسنے بولنے، ڈھولکی اور شادی بیاہ کے گیتوں کا شور سنائی دے رہا تھا، صحن میں، برآمدے میں اور اندر کردوں میں ہر طرف عورتیں ہی عورتیں دکھائی دے رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی وہ سب میری جانب متوجہ ہو گئیں۔ کچھ ہنسیں، کچھ نے سرگوشیوں میں ایک دوجے سے نہ جانے کیا کہا، میں اسی لیے اس طرح کے نسوانی ہجوم میں جانے سے ہمیشہ جھجکتا تھا، جب بہت سی عورتیں ایک جگہ جمع ہو جائیں تو وہ بہت بے باک ہو جاتی ہیں اور پھر معاملہ کسی ایسی منگنی یا شادی بیاہ کی تقریب کا ہو تو یہ بے باکی مردوں کو بھی مات دیتی ہے۔

خالہ مجھے دیکھ کر آگے بڑھی اور جلدی سے اس نے میری بلائیں لے لیں۔ نگہت جو سر ہمکائے گھونگھٹ نکالے بیٹھی تھی، اس نے میری آمد کا شور سن کر ہلکے سے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور اشارے سے اپنے پاس بلایا، شا کر نے میرے لیے بمشکل راستہ خالی کر دیا۔ میں نے نگہت کے سر پہ ایک ہلکی سی پچت لگائی۔

”میں جانتا تھا۔ یہ ساری شرارت تمہاری ہی ہوگی، کم از کم اپنی منگنی کے دن تو چپ کر



کے بیٹھی رہتیں۔۔۔۔۔“

نگہت گھونگھٹ تلے مسکائی۔

”حماد بھیا۔۔۔۔۔ ابا نے منگنی کے بعد مجھے کالج جانے سے منع کر دیا ہے۔ کہتے ہیں سُسرال والے بُرا مناتے ہیں۔ آپ ابا سے بات کیجئے نا۔۔۔۔۔ میری خاطر۔“ لو بھلا۔۔۔ لڑکیاں مہندی اور منگنی والے دن جانے کیا کیا سوچتی ہیں کہ ان کا ہونے والا دولہا کیسا ہوگا؟ کہاں ہوگا؟ اور ان محترمہ کو آج کے دن بھی اپنی پڑھائی کی ہی سوچ رہی ہے۔ مجھے زور کی ہنسی آگئی۔ میں نے دھیرے سے نگہت کے کان میں کہا۔

”تمہارے سُسرال والوں کی تو ایسی کی تھیں۔۔۔۔۔ بے فکر ہو جاؤ۔۔۔۔۔ کوئی تمہیں مزید پڑھنے سے نہیں روک سکتا۔ نہ تمہارے ابا اور نہ تمہارا چھ مہینے بعد ہونے والا میاں۔ میں خود بات کر لوں گا۔ اب خوش۔“

اور واقعی خوشی سے اُس کی آنکھوں میں آنسو ہی تو آ گئے۔ یہ لڑکیوں کا دل اتنا چھوٹا کیوں ہوتا ہے؟ ذرا ذرا سی بات پہ رو دینے والا، اور پھر خوش بھی کتنی چھوٹی سی بات پر ہو جاتی ہیں۔ دل کا شیشہ اتنا صاف کیسے رکھ لیتی ہیں یہ سب لڑکیاں۔۔۔۔۔؟

دفعۃً میری نظر چھوٹی حیا پر پڑی۔ وہ اسی کمرے میں موجود تھی جہاں نگہت کو بیٹھایا گیا تھا۔ حیا پاس بیٹھی کسی عورت سے ہلکی آواز میں کچھ بات کر رہی تھی، لیکن ایمان مجھے اس کمرے میں کہیں دکھائی نہ دی۔ میں اب یہاں سے نکلنا چاہتا تھا لیکن شا کر عورتوں کے اس ہجوم میں مجھے کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں بچپن سے اس گھر کے چپے چپے سے واقف تھا۔ سوچا ساتھ والے کمرے سے ہوتا ہوا پچھلے دروازے سے باہر نکل جاؤں گا کیونکہ سامنے برآمدے میں تو خواتین کی ایک بڑی تعداد نیچے فرش پر ہی دری ڈالے دھرنا جمائے بیٹھی تھیں۔ البتہ ساتھ والا کمرہ چونکہ رہائشی تھا اس لیے اس طرف کسی کے ہونے کا امکان کم ہی تھا۔ اس دوسرے کمرے کا ایک دروازہ پچھلے صحن میں کھلتا تھا، جہاں اس وقت دیکیں وغیرہ چڑھائی جا رہی تھیں۔

میں نے نگہت کو اشارہ کیا کہ میں بعد میں اس سے ملتا ہوں اور دونوں کمروں کو ملانے والے درمیان کے دروازے سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ کمرے میں شام کے وقت کی

وجہ سے ملگجھا سا اندھیرا چھایا ہوا تھا اور کمرہ سنسان تھا۔ میں اپنی ہی دھن میں پچھلے صحن کی طرف کھلنے والے جالی کے دروازے کی طرف بڑھا، اچانک دیوار کے ساتھ بنی ہوئی لکڑی کی بڑی سی الماری کے عقب سے کوئی جلدی میں اپنا آپ سنبھالتے ہوئے نکلا، اس الماری میں زیادہ تر گھر کی کراکری اور شیشے کے برتن وغیرہ پڑے ہوتے تھے۔ وہ سایہ اپنی ہی جھونک میں مجھ سے ٹکرایا اور اُس کے ہاتھ سے شیشے کی تین چار پلیٹیں پھسل کر فرش پر گر گئیں۔ ایک دبی سی نسوانی چیخ فضا میں ابھری، سچ تو یہ ہے کہ میں خود بھی بوکھلا سا گیا، مجھ سے ٹکرا کر وہ سایہ لڑا کھڑا سا گیا لیکن اس نے فوراً خود کو سنبھال لیا تھا، لیکن اس تمام معاملے میں سنبھلتے سنبھلتے آنچل ڈھلک کر کاندھوں پر آچکا تھا۔ وہ ایمان تھی، قیامت کی گھڑی کا تذکرہ تو سب نے ہمیشہ سنا ہوگا لیکن وہ قیامت کی گھڑی ہوگی کیسی؟ اس کا شاید کسی کو مجھ سے بہتر اندازہ کبھی نہ ہوگا۔ اُس کا حسن بے حجاب تھا اور مجھ سے اس قدر قریب تھا کہ اس کی الجھی ہوئی سانسوں کی مہک میں اپنے سینے پر محسوس کر سکتا تھا، اس کی مخصوص الجھی ہوئی سی لٹ بکھر کر اس کے چہرے پر آ پڑی تھی اور اس کا گلابی دودھ جیسا لیچ چہرہ اس وقت شرم، خوف اور حیا کے مارے انگارہ سا ہو رہا تھا۔

کیا کسی کی دعاؤں کا شمر قدرت نے اس قدر جلد اور اس قدر اعلیٰ انعام کے طور پر بھی دیا ہوگا۔۔۔۔۔؟ شاید کبھی نہیں۔

وہ ہڑبڑا کر بولی۔۔۔۔۔ ”معاف کیجئے۔۔۔۔۔ وہ میں۔۔۔۔۔ میں یہاں برتن لینے آئی تھی؟“

مجھ سے جواب میں کچھ بھی نہ بولا گیا۔ شاید میری زبان ہمیشہ کے لیے سلب کر لی گئی تھیں۔۔۔۔۔ اتنے میں برتن گرنے کی آواز سن کر پاس کے کمرے سے خالہ اور ایمان کی چھوٹی بہن حیا ہڑبڑائے ہوئے انداز میں کمرے میں داخل ہوئیں اور فرش پر بکھرا کالج اور مجھے اور ایمان کو وہاں کھڑا دیکھ کر جیسے خود ہی سب سمجھ گئیں۔ ایمان جلدی سے خالہ کی طرف بڑھ گئی۔ خالہ ہنس کر بولی۔ ”ڈر گئیں کیا؟۔۔۔۔۔ ارے یہ اپنا ہی بچہ ہے، حماد۔۔۔۔۔ نگہت کا تیسرا بھائی ہی سمجھو۔“

حیا نے ہنسی روکنے کے لیے پلو منہ میں لے لیا تھا۔ اب ایمان بھی سنبھل چکی تھی۔ اس



میں گھر جاتے ہوئے انہیں مولوی صاحب کے یہاں چھوڑنا جاؤں گا۔  
 ”یہی تو میں عبد اللہ میاں کو کہہ رہا ہوں بابا۔۔۔۔۔ لیکن یہ حضرت کچھ تکلف سے کام لے رہے ہیں۔“

”اس میں تکلف کی کیا بات ہے۔ میں ویسے بھی بس نکل ہی رہا تھا۔ راستے میں آپ لوگوں کو گھر چھوڑنا جاؤں گا۔“

عبد اللہ کے پاس میری تجویز ماننے کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ رات ڈھلتی جا رہی تھی اور اس وقت کسی دوسری سواری کا ملنا بھی اس علاقے میں محال تھا۔ جب تک میں گاڑی لے کر حویلی کے مرکزی گیٹ تک پہنچا، شا کر اندر سے دونوں لڑکیوں کو بھی بلالایا تھا۔ ایک ہی دن میں اتنے معجزے رونما ہو جائیں گے۔ یہاں آنے سے پہلے، ایسا میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ شا کر سے رخصت ہو کر وہ سب گاڑی میں سوار ہو گئے۔ عبد اللہ میرے ساتھ آگے بیٹھ گیا اور ایمان اور حیا پچھلی سیٹ پر۔ میں نے کار آگے بڑھا دی۔ یا خدا۔۔۔۔۔ یہ کوئی خواب تو نہیں تھا۔ نہیں۔۔۔۔۔ ضرور یہ کوئی خواب ہی ہوگا۔ وہ میرے ساتھ، میری ہی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر موجود تھی بیک دیوڑ میں میری نظریں اس کے سراپے کا طواف کرتی رہیں۔ گودہ مکمل پردے میں تھی اور صرف اس کی آنکھیں ہی اس کے نقاب سے باہر تھیں لیکن اس کا اس قدر قریب ہونا ہی کس قدر جاں فزا احساس تھا۔ میں کسی خواب کے عالم میں ہی گاڑی چلاتا رہا۔ عبد اللہ خود بھی خاموش طبیعت اور کم گو تھا کچھ میں بھی اپنے خیالات کی رو میں بھٹکا ہوا تھا۔ راستے بھر ہم خاموش ہی رہے۔ اس دن پہلی مرتبہ مجھے سڑکوں کے خالی ہونے اور رات کی وجہ سے رش نہ ہونے پر بے حد غصہ آیا۔ فاصلہ بہت تیزی سے طے ہو رہا تھا۔ پچھلی سیٹ پر وہ دونوں خاموش بیٹھی تھیں۔ ایمان مسلسل کھڑکی سے باہر گزرتے نظاروں کو ہی دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ بھی دانستہ پانا دانستہ طور پر سامنے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ اور میں سب کی نظر بچا کر مسلسل شیشے میں اسی کو دیکھے جا رہا تھا۔ جانے اس انجانی سی لڑکی نے مجھ پر یہ کیسا جادو کر ڈالا تھا کہ میں دھیرے دھیرے اپنے اوپر اپنا تمام اختیار ہی کھوتا جا رہا تھا۔۔۔۔۔

پلک جھپکنے میں ہی مولوی علیم کا محلہ آ گیا۔ رات کی وجہ سے محلہ بھی بالکل سنسان پڑا

نے جلدی سے ہاتھ اٹھا کر ماتھے تک لے جا کر جیسے مجھے آداب کیا۔ خالہ ہنستے ہوئے بولی۔  
 ”اچھا تم جاؤ۔۔۔۔۔ میں اور خیال یہ کالج اٹھالیں گے۔ وہاں نگہت اکیلی ہے۔“ ایمان جلدی سے سٹ پٹائی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ خالہ نے پھر سے مجھے کھانا کھائے بغیر واپس نہ جانے کی ہدایت کی۔ مجھے یاد نہیں کہ میں اس کمرے سے کب اور کس طرح باہر نکلا تھا۔ یہ ایک پل میں کیا ہو گیا تھا۔ کیا آج قدرت نے ایک ہی دن میں میرے اس حقیر جنم میں کی ہوئی چند گنی جینی نیکیوں کا صلہ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ میرے کس قدر قریب تھی۔۔۔۔۔ میری شہ رگ سے بھی قریب۔۔۔۔۔ سچ یہ ہے کہ اُس دن مجھے خدا پر جس قدر ٹوٹ کر پیار آیا، اتنا پہلے کبھی نہ آیا تھا۔ ہم انسان بھی کتنے ناشکرے ہوتے ہیں۔ آس پاس کی چیزوں سے، رشتوں سے، خدا کی بانی ہوئی نعمتوں سے دن میں جانے کتنی مرتبہ پیار جتاتے ہیں۔ ان کے پیار کا ذکر کرنے سے ہی ہماری آنکھیں تک بھینکنے لگتی ہیں۔ لیکن ہمیں اس خدا پر کبھی پیار نہیں آتا جو ہمارے جینے کے یہ سب بہانے پیدا کرتا ہے۔

مجھے بھی پہلے کبھی نہیں آیا تھا، لیکن اس دن آیا اور بہت ٹوٹ کر آیا، مجھے میری توقعات سے کہیں بڑھ کر نوازا تھا اس نے، میں بے خود سا کسی سے کش کی طرح آس پاس سے بیگانہ وہیں کسی گوشے میں بیٹھا رہا۔ کھانا لگ چکا تھا۔ شا کر نے اسی گوشے میں مجھے کچھ لا دیا۔ جانے کب تقریب ختم ہوئی اور لوگ دھیرے دھیرے رخصت ہونے لگے۔ میں تب چونکا جب میرے سامنے سے عورتوں کی آخری ٹولی بھی جلدی جلدی اپنی چادریں اور برقعے سنبھالتی گزر گئی۔ مجھے اپنی بے خودی پر غصہ آیا۔ کتنی دیر بیت گئی تھی۔ وہ ضرور واپس چلی گئی ہوگی۔ میں جلدی سے اٹھ کر گیٹ کی طرف آیا، وہاں عبد اللہ کو شا کر کے ساتھ کھڑے دیکھ کر میری جان میں جان سی آ گئی۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ان کے قریب پہنچا۔ شا کر نے مجھے دیکھ کر کہا۔

”لو۔۔۔۔۔ حماد بابا بھی آ گئے۔ اب مسئلہ حل ہو جائے گا۔“

پتہ چلا کہ مہمانوں کو واپس پہنچانے کی غرض سے جو گاڑی کرائے پر منگوائی گئی تھی۔ اُسے شا کر کا بڑا بیٹا لے کر گیا تھا لیکن اس کی واپسی میں دیر ہو گئی تھی۔ عبد اللہ کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔ میں نے جھپکتے ہوئے شا کر کو تجویز پیش کی کہ اگر وہ مناسب سمجھے تو



## پہلی کلاس

اچانک میری آنکھ الارم کلاک کی تیز کھنٹی سے کھل گئی۔ صبح کے سات بج رہے تھے۔ کچھ دیر تو مجھے سمجھ ہی نہیں آیا کہ یہ شور کیسا ہے۔ میں نے کھڑکی سے باہر نظر ڈالی۔ آج لندن کا آسمان پھر سے سفید بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اور شاید ہلکی ہلکی بوند باندی بھی ہو رہی تھی۔ پھر مجھے یاد آیا کہ آج سے میری باقاعدہ کلاسز شروع ہو رہی ہیں اور مجھے نو بجے والی پہلی کلاس کے لیے آٹھ بجے تک ہر حال میں سب دے پہنچ جانا چاہیے کیونکہ اگر آٹھ بج کر دس منٹ والی ٹرین نکل گئی تو سمجھو پہلا پیر یڈ بھی گیا۔

انسان کی بہت عجیب فطرت ہے۔ جس چیز کا اسے پابند بنا دیا جائے، اُسے رفتہ رفتہ وہ پابندی بوجھ لگنے لگتی ہے۔ عام حالات میں میں اگر پوری رات بھی شب بیداری کر کے اٹھتا تو مجھے تب بھی کبھی اتنا بُرا نہیں لگا جتنا اس دن مجھے یونیورسٹی پہنچنا لگ رہا تھا۔ بادل خواستہ میں نے نیم گرم پانی سے شاور لیا اور گرم کافی کا ایک مگ حلق میں انڈیلا، کامران جاچکا تھا۔ لباس تبدیل کر کے میں نیچے اُترا، کسی بھی شہر کی صبح، اس کے عام دن کے مقابلے میں بہت مختلف اور کبھی کبھی بے حد خوشگوار ہوتی ہے۔ سبھی لوگ نیند سے جاگ کر اپنے اپنے روز مرہ کے معمولات کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ جیسے اس وقت وہ اسپینش گٹار بجانے والی لڑکی سامنے سے گزرتی ٹرام سے بس اُتری ہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں اس کا وہی مخصوص گٹار میس تھا۔ سچ یہ ہے کہ صبح صبح اُس کے چہرے پر جوتا زگی تھی اور آنکھوں میں نیند کا ہلکا سا جو اُمار تھا، اس نے اسے پہلے سے کہیں زیادہ حسین بنا دیا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی۔ ہم دونوں میں اب کافی شناسائی ہو چکی تھی۔ میں نے جیب سے چند سکے نکال کر اُسے دینا چاہے، لیکن اس نے مسکرا کر میرا ہاتھ روک دیا۔ میں نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔ اس نے اپنی والی پھوٹی انگریزی میں مجھے بتایا کہ وہ پیسے صرف اپنی گٹار کی دھنوں کے عوض لیتی ہے، اور

تھا۔ میں نے مولوی صاحب کی گلی میں موڑ کر گاڑی کھڑی کر دی۔ عبداللہ نے نہایت ممنونیت سے میرا شکریہ ادا کیا اور رہسما اندر آنے کو بھی کہا۔ میں نے شکریہ کہا کہ رات بہت بیت چکی ہے۔ پھر کبھی سہی، ایمان اور حیا بھی گاڑی سے اُتر چکی تھیں۔ ایمان تو خاموش رہی البتہ حیا نے اُترتے اُترتے دھیرے سے شکریہ کہا، میں صرف سر ہلا کر رہ گیا، میں نے گاڑی واپس موڑی اور عبداللہ کو سلام کرتے ہوئے آگے بڑھادی۔ گلی سے نکلتے نکلتے میں نے بیک دیو مرر میں دیکھا کہ دروازہ کھل چکا تھا اور وہ تینوں اندر داخل ہو رہے تھے۔ پھر جانے کب میں گھر پہنچا اور کس طرح میں نے خود کو اپنے بستر تک پہنچایا۔ لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اس ساری رات میں میں ایک پل کے لیے بھی پلکیں نہیں جھپک پایا تھا۔ اس رات مجھے احساس ہوا کہ عشق کا ڈنگ اپنا وار کر چکا ہے اور اب زہر دھیرے دھیرے میرے جسم کی تمام رگوں میں پھیلتا جا رہا ہے۔۔۔۔



اس نے تو ابھی تک مجھے کوئی دھن سنائی ہی نہیں ہے۔ اس لیے وہ یہ پیسے قبول نہیں کر سکتی۔ مجھے اس کی یہ بات جانے کیوں بہت اچھی لگی۔ میں نے ہنس کر اُسے کہا کہ یہ آج کی دھن کے پیسے نہیں ہیں۔ دو دن پہلے میں کافی فاصلے پر کھڑا اس کی دھن بہت دیر تک سنتا رہا تھا لیکن تب میری جیب میں سکے نہیں تھے۔ یہ اُسی دن کا ادھار ہے۔ یہ سن کر وہ بھی ہنس پڑی اور پھر اس نے انکار نہیں کیا اور میری ہتھیلی پر پڑے سکے اٹھا لیے۔ اس دن پہلی مرتبہ اس نے مجھے اپنا نام بتایا۔ ”جینی“ اور مجھ سے میرا نام پوچھا۔ میرا نام دھران اُس کے لیے اتنا آسان نہ تھا۔

”آ۔۔۔ ماڈ۔۔۔“ مجھے ہنسی آ گئی۔ اس نے بالکل ایسے کہا تھا کہ جیسے ہمارے ہاں کوئی کہے ”آ۔۔۔ بیل۔۔۔“ مجھے مار۔۔۔ میں نے اُسے اپنے نام کا مختصر صورت بتائی۔ ”میڈی“۔۔۔ اس نے خوشی سے دہرایا۔ سینور۔۔۔ میڈی۔۔۔ میں ہنس کر آگے بڑھ گیا۔ جب تک میں یونیورسٹی پہنچا۔ تب تک بوند باندی باقاعدہ بارش کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ کلاس میں سبھی اسٹوڈنٹس موجود تھے۔ پہلی کلاس سر آ نرک کی ہی تھی۔ ان کے کلاس میں داخل ہوتے ہی کلاس میں سناٹا چھا گیا اور واحد آواز صرف کلاس کی اونچی اونچی بڑی شیشے کی کھڑکیوں پر پڑتی بارش کی بوچھاڑ کی تھی۔ کبھی کبھی یہ آواز باقاعدہ ایک جلت رنگ کی سی کیفیت اختیار کر لیتی تھی۔ سر آ نرک نے پہلے پیریڈ میں معاشیات کی چند موٹی موٹی باتیں بتائیں جن میں سے آدھی میرے سر کے اوپر سے گزر گئیں۔ کچھ اس وجہ سے کہ بہت دنوں سے میں کتابوں سے بہت دور رہا تھا اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ میرا دھیان کلی طور پر لیکچر کی طرف نہیں تھا۔ جب ہمیں ٹائم ٹیبل بانٹا گیا تھا تو اس میں ایک سبجیکٹ (Subject) میرے لیے قطعی طور پر نیا اور انجانا تھا۔ اس مضمون کا نام ٹائم ٹیبل شیٹ میں ”ہیومنیزنگ“ (Humanizing) دیا گیا تھا۔ آج اس مضمون کا پہلا لیکچر ساڑھے گیارہ بجے ہال نمبر سات میں تھا۔

مجھے اس وقت بڑی حیرت ہوئی جب سر آ نرک پھر سے کالا گاؤن پہنے کلاس میں داخل ہوئے۔ پتہ یہ چلا کہ یہ خاص مضمون خود سر آ نرک کی ہی فرمائش پر کورس میں شامل کر گیا ہے۔ بنیادی طور پر لفظ ہیومنیزنگ دو لفظوں کا مرکب تھا نمبر ایک ہیومن اور نمبر دو انجینئرنگ یعنی ”ہیومن انجینئرنگ“ یا دوسرے لفظوں میں آپ اسے انسانی نفسیات کی ترقی

بھی کہہ سکتے ہیں۔

سر آ نرک کے خیال میں ان کی یونیورسٹی سے فارغ التحصیل طلباء کو نہ صرف اپنے شعبوں میں کامیابی سے داخل ہونا چاہیے بلکہ انہیں نفسیاتی طور پر بھی اتنا مضبوط ہونا چاہیے کہ وہ اپنے فیصلے پوری قوت کے ساتھ اپنے مختلف محکموں میں رائج کر سکیں۔ اسی لیے خصوصی طور پر انہوں نے ہیومنیزنگ کا یہ سبجیکٹ (Subject) خود اپنے پڑھانے کے لیے منتخب کیا تھا۔ آج پہلے لیکچر کا موضوع تھا ”بہت زیادہ عقل مندی بھی حماقت کا دوسرا نام ہے۔“

سر آ نرک کا کہنا تھا کہ ہم اپنی زندگی میں جن لوگوں کو بہت شدت سے چاہتے ہیں۔ اندر ہی اندر ہم کہیں نہ کہیں انجانے میں اُن سے ایک خاص قسم کی چڑچڑاہٹ بھی پال رہے ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے پیار میں ہماری بے بسی اور انہیں کھودینے کا خوف ہمیں ان کے سامنے اس مخالف جذبے کے اظہار سے روکتا ہے۔ بلکہ کبھی کبھی تو یہ اندرونی چڑچڑاہٹ اندر ہی اندر گل سڑ کر شدید نفرت کا رخ دھاڑ لیتی ہے، اسی لیے جب کبھی ایسے شدید محبت کے رشتے ٹوٹتے ہیں تو ایک پل میں ہی شدید نفرت کا رخ اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن یہ اننگ پل میں ہوئی نفرت دراصل پچھلے بہت لمبے عرصے سے ہمارے اندر پلتے منفی جذبات کا نچوڑ ہوتی ہے۔ اُس دن میں نے محسوس کیا کہ سر آ نرک صرف ایک اچھے اور ماہر معاشیات ہی نہیں ہیں بلکہ ان کے اندر ایک فلاسفر ایک دانش ور بھی کہیں چھپا بیٹھا ہے۔ لیکچر ختم ہونے کے بعد انہوں نے کلاس کو اس موضوع پر اظہار خیال کی دعوت دی۔ میں نے اپنی باری آنے پر کہا۔

”جذبہ چاہے شدید محبت کا ہو یا شدید نفرت کا، دونوں صورتوں میں انسان کو توڑ دیتا ہے۔“ میں ذاتی طور پر نفرت سے زیادہ محبت کو خطرناک جذبہ سمجھتا ہوں۔ اور پھر۔۔۔۔۔“

میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی میرے سامنے بیٹھی سنہرے بالوں والی ایک لڑکی نے غصے اور نفرت سے پلٹ کر مجھے دیکھا اور بولی۔

”کچھ لوگوں کی فطرت میں ہی ہر بات سے اختلاف کرنا شامل ہوتا ہے ایسے لوگوں کی تربیت میں ہی ضد اور ہٹ دھرمی موجود ہوتی ہے۔“

میں اس لڑکی کو نام سے نہیں جانتا تھا، لیکن اس کا رول نمبر بائیس تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ جس دن سے میں یونیورسٹی میں آیا تھا یہ لڑکی اور اس کے چار پانچ دوستوں کا



مخصوص گروپ کسی نہ کسی طور پر میرے مذہب اور میری قومیت کو طنز اور مذاق کا نشانہ بناتے رہتے تھے۔ عام طور پر میں ان کی سنی، اُن سنی کر دیتا تھا کیونکہ میں ان بے مطلب کی باتوں میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اس وقت جانے کیوں میں بھی اپنے آپ پر اختیار کھو بیٹھا۔

”اس احساس کمتری کا شکار تو مجھے وہ لوگ لگتے ہیں جنہیں بظاہر اپنی تربیت پر بے حد تازہ ہوتا ہے لیکن حقیقت میں ان کے اندر کی جہالت کہیں نہ کہیں رنگ دکھائی جاتی ہے۔“

یہ سنتے ہی اس رول نمبر بانیس کا رنگ غصے سے سُرخ ہو گیا۔ اس نے پلٹ کر مجھے کچھ جواب دینے کی کوشش کی۔ لیکن سر آ نرک نے روسٹرم پر زور سے ڈسٹر مار کر ہم دونوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

”پلیز پلیز۔۔۔ آپ لوگ آپس میں بحث کرنے سے گریز کریں۔ اختلاف رائے ہم سب کا حق ہے لیکن اسے اخلاق کی حدود میں ہی رہنا چاہیے۔ مس سارہ پیریز، آپ مجھ سے لیکچر کے بعد میرے آفس میں ملیں۔“

اتنے میں لیکچر ختم ہونے کی گھنٹی بھی بج گئی۔ اس دن مجھے پتہ چلا کہ اس آتش صفت کا نام سارہ ہے۔ دیکھنے میں کسی بہت معقول گھرانے کی لگتی تھی لیکن جانے مجھ سے اس کی کیا پر خاش تھی۔ سارہ اور اس کا گینگ مجھے خونخوار نظروں سے دیکھتے ہوئے کلاس سے نکل گئے۔ میں نے بھی اپنا بیگ گلے میں لٹکایا اور باہر نکل آیا۔ بارش تھم چکی تھی لیکن سردی کی شدت بڑھ گئی تھی۔ میں نے فوراً ہاتھ رگڑ کر اپنی جیکٹ کی جیبوں میں ڈال لیے۔ اور ابھی آگے بڑھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اٹینڈنٹ نے آکر بتایا کہ سر آ نرک مجھے اپنے دفتر میں یاد کر رہے ہیں۔

میں نے اس راہداری کی طرف قدم بڑھا دیے جس کے اختتام پر سر آ نرک کا دفتر موجود تھا۔ بیرونی دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور دروازہ کھول کر دیکھا اندر سارہ غصے میں بھری سر آ نرک کے میز کی مخالف سمت پڑی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے اس مختصر وقفے میں سارہ کے منہ سے نکلے ہوئے چند الفاظ سنائی دیے۔

”مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ نے ایک مسلمان کو بنا کسی خاص وجہ کے اپنی یونیورسٹی میں ایڈمشن کیسے دے دیا۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ۔۔۔“ سارہ کی بات آدھی رہ گئی کیونکہ میں تب تک اندر داخل ہو چکا تھا۔ سر آ نرک نے مجھے دیکھ کر کہا۔

”آؤ حماد۔۔۔ آؤ۔۔۔“

سارہ چپ سی ہو گئی۔ میں میز کے سامنے لگی دوسری کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ سر آ نرک نے سامنے پڑی فائل پر کچھ نوٹ کر کے اسے بند کر دیا اور پھر نظر اٹھا کر ہم دونوں کی طرف دیکھا۔

”میں چاہتا تھا کہ تم دونوں کا آپس میں تعارف کروادوں۔ شاید اس سے چیزوں کو سمجھنے میں کچھ آسانی ہو جائے۔ سارہ۔۔۔۔۔ ان سے ملو۔۔۔۔۔ یہ حماد امجد رضا ہیں۔ ان کے دادا برٹش گورنمنٹ میں وائسرائے کے ذاتی سٹاف میں نہایت اُونچے عہدے پر فائز رہے ہیں۔ ہماری یونیورسٹی میں داخلے کی تمام کڑی شرائط پر پورا اُترنے کے بعد ان کا داخلہ منظور کیا گیا ہے، ان کا شمار ہمیشہ سے بہترین طالب علموں میں رہا ہے۔“

سارہ نے یہ ساری گفتگو ایک خاص نخوت بھرے انداز میں سنی۔ پھر آ نرک نے سارہ کی طرف اشارہ کیا۔ ”اور مسٹر حماد۔۔۔۔۔ ان سے ملیے۔۔۔۔۔ مس سارہ پیریز۔۔۔۔۔ سارہ آ نرک پیریز۔۔۔۔۔ اس یونیورسٹی کی پچھلے چار سمسٹر سے لگاتار پوزیشن ہولڈر۔۔۔۔۔ اور میری بیٹی۔ مجھے اُمید ہے کہ تم نے اس کی تلخ کلامی کا زیادہ اثر نہیں لیا ہوگا۔“

ادہ۔۔۔۔۔ تو یہ خوبصورت بلا سر آ نرک کی بیٹی تھی۔ ایک یہودن۔۔۔۔۔ تبھی اس کے لہجے سے ہر وقت ایک خاص قسم کا زہر ٹپکتا تھا۔ اس وقت بھی وہ چہرہ دوسری طرف کیے، تکبرانہ انداز میں بیٹھی ہوئی تھی جیسے اس کے ساتھ والی سیٹ پر نہیں یا ایک انسان نہیں بلکہ کوئی حقیر کیڑا مکوڑا بیٹھا ہو۔ پھر سر آ نرک نے ہم دونوں کو کلاس روم کے آداب اور یونیورسٹی ڈسپلن کے بارے میں ایک چھوٹا سا لیکچر دیا اور ہم دونوں سے اُمید ظاہر کی کہ آئندہ ہماری وجہ سے کلاس کا ماحول تناؤ کا شکار نہیں ہوگا۔ ہم دونوں ہی چپ کر کے سنتے رہے اور پھر ہمیں واپس جانے کی اجازت مل گئی۔ ہم دونوں تقریباً ساتھ ہی کمرے سے نکلے اور ایک دوسرے کو دیکھے بنا مخالف سمتوں میں روانہ ہو گئے۔ اس دن مجھے احساس ہو گیا تھا کہ شاید میں اس یونیورسٹی سے معاشیات کی ڈگری اتنی آسانی سے لے کر نہیں جا پاؤں گا۔ میرے اور سارہ کے درمیان جس سرد جنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔ وہ بہت جلد ایک بڑے طوفان کی شکل اختیار کرنے والی تھی۔



ہر انسان کا مقدر ہی ہمیشہ اور کبھی نہ ختم ہونے والا یہ سفر ہوتا ہے۔

کل تک ایمان کی صرف ایک جھلک کو پانا ہی میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ قدرت نے میری یہ خواہش پے در پے کئی مرتبہ پوری کر دی تھی لیکن آج میری التجاؤں کی حد صرف دیکھ لینے سے کہیں بڑھ کر تھی۔ میں اس تک اپنے جذباتوں کی آنچ پہنچانا چاہتا تھا۔ اپنا یہ احساس اس تک منتقل کرنا چاہتا تھا۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ شاید انسان کی ناشکری کی لمبائی وجہ بھی کسی مقصد کسی آرزو کو پالینا ہوتا ہے۔ نہ ہم آرزو کو پاتے اور نہ ہی نئی خواہشات اہم لیتیں۔۔۔۔۔ بس ساری زندگی کسی ایک تمنا میں ہی گزر جاتی تو کتنا اچھا ہوتا۔

نہ میں ایمان کو اس پارٹی کے بعد دوبارہ کبھی دیکھ پاتا اور نہ ہی آج میں اس بخوں میں اٹھا ہوتا۔ ساری زندگی در بدر اس کی دوسری جھلک دیکھنے کے لیے ہی بھٹکتا رہتا تو اچھا ہوتا۔ دن اسی کش مکش میں گزر رہے تھے اور راتیں اسی کرب میں کٹتی تھیں۔ ایک دن شاکر نام کے وقت مجھے ڈھونڈتا ہوا اچھٹ پر آ پہنچا، جہاں میں بہت دیر سے بیٹھا جاتی گرمیوں کا درج ڈھلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ گرمیوں کا سورج ڈھلتے ڈھلتے بھی کتنا وقت لیتا ہے، جسے رات سے اس کی کوئی جنگ چل رہی ہو، اور وہ اپنی دوست شفق کو رات کے کالے سایوں کے والے نہ کرنا چاہتا ہو۔

”ارے حماد بابا آپ یہاں ہو۔۔۔۔۔ کب سے آپ کو ڈھونڈ رہا ہوں، یہ نگہت نے آپ کے لیے دیا ہے۔“

شاکر نے ایک رقعہ میرے حوالے کیا اور پھر واپس چل دیا۔ پھر جیسے اُسے کچھ یاد آیا۔ ”اور ہاں۔۔۔۔۔ کہہ رہی تھی کہ حماد بھائی سے کہنا کہ اپنا وعدہ جلدی پورا کریں۔“ شاکر بیٹی کا پیام دیتے ہوئے اپنے آپ ہی مسکرا دیا اور وہاں سے چلا گیا۔ میں نے رقعہ کھول کر دیکھا۔ صرف چند سطریں ہی لکھی تھیں۔

”پیارے بھیا۔“

اپنا وعدہ بھول گئے نا، ابا سے میری پڑھائی کی بات بھی نہیں کی۔ امتحانات سر پر آ رہے ہیں۔ اگر فارم نہیں بھرے تو میرا سال ضائع ہو جائے گا۔ آپ کی سفارش کی منتظر۔۔۔۔۔“

## زہرِ عشق

میں اس رات ایمان کو اس کے گھر چھوڑ تو آیا تھا لیکن اس بل کے بعد مجھے یوں لگتا تھا کہ وہ ہر گھڑی جیسے میرے ساتھ ساتھ ہی رہتی ہو۔ میں نے عشق اور محبت کی بہت سی داستانیں سن رکھی تھیں لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ اس عشق کا ڈنگ اتنا زہریلا ہوگا۔ ایک ہی بل میں یہ عشق کا زہر میری نس نس میں سرایت کر گیا اور اب میری حالت ایسی تھی کہ دن رات کی تڑپ ہی میرا مقدر تھی۔

محبت بذاتِ خود ایک سب سے بڑے عذاب کی صورت میں وارد ہوتی ہے۔ اور اگر بد قسمتی سے یہ محبت یک طرفہ ہو تو یہ ہر بل انسان کو کچھ کے لگاتی رہتی ہے۔ ایک ایک بل میں انسان سو سو بار جیتا ہے اور سو سو بار مرتا ہے۔

مجھے کوئی صورت بھائی نہیں دے رہی تھی کہ آخر کس طرح ایمان تک میرے اندر لگی اس آگ کی آنچ پہنچ سکے۔ اس کا گھر سے نکلنا محال تھا۔ میں پہلے ہی کئی کئی دن گھنٹوں تک اس کے گھر کے باہر پہرہ دے چکا تھا۔ اور اب تو عبد اللہ بھی مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ گھر کے باہر کھڑے رہنے میں اس سے سامنا ہونے کا خطرہ بھی ہر لمحے موجود تھا۔ اور پھر ایمان جیسی لڑکی کو یوں سر راہ روک کر بات کرنا بھی اب مجھے بے حد معینوب محسوس ہو رہا تھا۔ جانے وہ اس بات سے میرے متعلق کیا تاثر لیتی؟۔۔۔۔۔ تو پھر کیسے۔۔۔۔۔ آخر اس تک رسائی کیسے ہو۔۔۔۔۔؟ دن رات بس یہی ایک سوال اور یہی ایک دھن میرے سر پر برسا رہتی تھی۔

یہ سچ ہے انسان کی آرزوؤں اور خواہشات کی کبھی کوئی حد مقرر نہیں کی جاسکتی۔ ہر منزل پر پہنچ جانے کے بعد اُسے وہ منزل ایک سنگ میل لگنے لگتی ہے اور کوئی نئی اور اگلی منزل اس کی خواہش کا روپ دھار لیتی ہے۔ اور اسی سفر میں ہی انسان کی زندگی تمام ہو جاتی ہے۔



جاتیں۔ سموے اور پکڑے بنوائے جاتے، کولڈ ڈرنک کے کریٹ باغ میں بہتی صاف پانی کی نالی میں رکھوا دیے جاتے، آموں کی بڑی بڑی ٹوکریاں چھکڑوں میں لدوا کر حویلی کے نعمت خانے میں پہنچوا دی جاتیں۔ آہ۔۔۔۔۔ ابھی چند ہفتے پہلے تک میں کس قدم جیتا جاگتا انسان تھا۔ اس ایک محبت نے تو جیسے میرے جسم سے روح تک ہی نچوڑ لی تھی۔

نگہت اور خالہ کا معمول تھا کہ ان میں سے جس کسی کو بھی میرے حویلی پہنچنے کی اطلاع کسی چوکیدار وغیرہ سے ملتی تو وہ فوراً میرے ساتھ آنے والے مہمانوں کے بارے میں پوری معلومات کر کے فوراً چائے ناشتہ وغیرہ بھجوا دیتیں۔ میں کبھی تنہا ہوتا تو نگہت خود آ جاتی اسے نت نئی کتابیں پڑھنے اور منگوانے کا بہت شوق تھا، شاکر کے سامنے تو وہ کھل کر کوئی فرمائش کر ہی نہیں پاتی تھی کیونکہ شاکر اس کی فرمائشوں پر اُسے جھڑک دیتا تھا۔

اس دن بھی یہی ہوا، جیسے ہی نگہت کو میرے آنے کی خبر ہوئی۔ وہ کچھ ہی دیر میں چائے اور نمکین بسکٹ وغیرہ ایک ٹرے میں رکھ کر وہاں آن پہنچی۔ اس دن نگہت کے چہرے سے ہی فوشی پھوٹ رہی تھی۔ پتہ چلا کہ رات ہی شاکر نے اُسے اپنے طور پر آگے پڑھنے کی اجازت دے دی تھی۔ اور وہ جانتی تھی کہ یہ سب میری ہی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ اس نے آتے ہی میرا خلوص دل سے شکر یہ ادا کیا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں اپنی بات کا آغاز کہاں سے کروں۔ نگہت بھی میری کش مکش کو بھانپ گئی۔

”کیا بات ہے حماد بھائی جان۔۔۔۔۔ آپ کچھ کھوئے کھوئے سے لگ رہے ہیں۔“

”جی۔۔۔۔۔ اُس دن منگنی میں تمہیں وہ لڑکی یاد ہے۔۔۔۔۔ وہی جو مجھ سے اندھیرے کمرے میں ٹکرائی تھی۔“

نگہت اپنی ہی دھن میں کپ میں چائے انڈیلتے ہوئی بولی۔

”کون۔۔۔۔۔ ارے ہاں۔۔۔۔۔ امی جان نے مجھ کو بتایا تھا“ نگہت کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

”وہ ایمان تھی۔ ہمارے پُرانے محلے میں رہتی ہے۔ مولوی علیم الدین صاحب کی بیٹی ہے۔ بہت اچھی لڑکی ہے بھیا۔“

پھر جیسے نگہت کو کچھ خیال آیا اور وہ غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ”خیر تو ہے

تب مجھے یاد آیا کہ واقعی میں نے نگہت کی منگنی کے دن اُس سے شاکر سے بات کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اب بھلا اُسے کیا خبر کہ آج کل تو مجھے اپنا ہوش بھی نہیں رہتا تھا۔ کسی سے کیے ہوئے وعدوں کا کیا بھرم رکھ پاتا۔ لیکن میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ آج ہی شاکر سے اس مسئلے پر حتمی بات کروں گا۔ میں جانتا تھا کہ شاکر میری بات کبھی رد نہیں کرے گا۔ اور اس کے لیے اگر ہم دونوں کو نگہت کے منگیتر کے پاس بھی جانا پڑتا تو میں اس کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔

میں نگہت کا رقعہ اپنے ہاتھوں میں پکڑے یونہی خالی الذہن سا بیٹھا ڈوبتے سورج کو دیکھ رہا تھا۔ تبھی اچانک میرے ذہن میں جیسے ایک جھماکا سا ہوا۔ نگہت۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ نگہت بھی تو وہ ذریعہ ہو سکتی تھی۔ وہ ایمان اور حیا کی سہیلی تھی۔۔۔۔۔ ایمان تک براہ راست پہنچنے کا واحد ذریعہ۔۔۔۔۔ حیرت ہے۔ اتنے دن پہلے تک میں دیواروں سے ٹکراتا رہا لیکن مجھے نگہت کا خیال کیوں نہیں آیا؟

اور اب جب یہ خیال میرے ذہن میں آ ہی گیا تھا تو جیسے میری بے چینیوں کو بھی ایک نئی راہ مل گئی تھی۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طور اُڑ کر شاکر کے گھر پہنچ جاؤں۔ بحر طور میں نے جیسے تیسے کر کے وہ رات کاٹی۔ اور اگلی صبح سویرے ہی میں پُرانی حویلی پہنچ گیا۔ گزری شام میں نے شاکر کے جاتے جاتے اس سے نگہت کی مزید تعلیم کے سلسلے میں بات بھی کر لی تھی۔ شاکر نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ نگہت کے منگیتر عامر سے اس سلسلے میں خود بات کر لے گا۔

گھر سے نکلتے ہوئے میں شاکر کو بتاتے ہوئے آیا تھا کہ میں پُرانی حویلی کی طرف رہا ہوں۔ یہ ایسی کوئی خلاف معمول بات نہیں تھی۔ میں کئی مرتبہ اپنے دوستوں کی وہاں پارٹ وغیرہ منعقد کر چکا تھا۔ کامران جب بھی لندن سے واپس آتا تو ہم دونوں کا دن رات کاٹھکا وہی پُرانی حویلی ہی ہوتی تھی۔ تب میں کتنا زندہ دل تھا، ہر وقت اس حویلی کے درودیا ہمارے قہقہوں سے، تیز میوزک سے اور ہمارے ہلے گلے سے گونجتے رہتے تھے۔ ایسے ہم نگہت اور خالہ سے ہی فرمائشیں کر کر کے مزے مزے کے پکوان بنواتے تھے۔ خاص طور پر ساون کی بارشوں میں ہم دن بھر پائیں باغ میں دھا چوکڑی مچاتے۔ پوریاں تلو



ہے اور آپ سے پہلے بھی کئی نوجوان اس کی ایک جھلک کے لیے سالوں اس کے گھر اور گلی کے چکر کاٹتے رہے ہیں۔ لیکن ایمان نے نظر اٹھا کر بھی ان کی طرف نہیں دیکھا۔ میرا آپ کو بھی یہی مشورہ ہے کہ آپ اس کا خیال اپنے دل سے نکال دیں۔۔۔۔۔ وہ زور سے ہنسی یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ آپ کا تو کچھ نہیں بگڑے گا البتہ میں اپنی سب سے پیاری دوست کو ہمیشہ کے لیے کھودوں گی۔“

مجھے نگہت کی بات سن کر غصہ آ گیا۔ میں اُٹھ کر جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ تم رہنے دو۔۔۔ میں خود ہی کچھ کر لوں گا۔“

میں نے جانے کے لیے قدم آگے بڑھائے۔ نگہت نے جاتے جاتے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اُس کے چہرے پہ شریسی مسکراہٹ تھی۔

”اوہو۔۔۔۔۔ روٹھ گئے پیارے بھتیجا۔۔۔۔۔ لگتا ہے آپ واقعی ایمان کے لیے سنجیدہ ہیں۔۔۔۔۔ پھر تو واقعی کچھ کرنا ہی پڑے گا۔“

”تو پھر کچھ سوچو۔۔۔۔۔ آخر تم کس مرض کی دوا ہو۔ اپنے بھتیجا کا اتنا سا کام نہیں کرو گی۔“

میں اور نگہت سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور ایمان تک یہ راز دل پہنچانے کے مختلف طریقوں پر اور کرنے لگے۔ کبھی مجھے کوئی طریقہ سوچتا تو نگہت اُسے رد کر دیتی اور کبھی نگہت کے ذہن میں کوئی بات آتی تو وہ طریقہ مجھے نہ بھاتا۔ اسی شش و پنج میں جانے کتنی دیر بیت گئی لیکن ہم فیصلے پر نہ پہنچ پائے۔ میں نے نگہت کو ایمان کے نام ایک مختصر سارقعہ لکھ کر دینے کی تجویز بھی دی تھی لیکن نگہت نے صاف انکار کر دیا تھا اس کے کہنے کے مطابق ایمان کبھی اس قلعے کو کھول کر نہ پڑھتی اور اسے پھاڑ دیتی۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ اس بات پر نگہت سے بھی ہاشم کے لیے بات چیت بند کر سکتی تھی۔

تھک بار کر میں تو سر تھام کر وہیں بیٹھ گیا۔ نگہت سے اپنے لاڈلے بھتیجا کی یہ حالت مسمی نہیں گئی اور اُس نے حياء کو اس معاملے میں اپنا راز دار بنانے کی ٹھان لی۔ طے یہ پایا کہ نگہت کسی بہانے ایمان اور حياء کو اپنے گھر بلوائے گی۔ حالانکہ اس معاملے میں مولوی صاحب بہت سخت اصول پسند واقع ہوئے تھے لیکن نگہت کے مطابق وہ ایک بار انہیں مولوی

بھیا۔ آپ ایمان کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں۔“  
اس کی آنکھوں میں ایک خاص شرارت تھی۔ میں کچھ گڑبڑا سا گیا۔ دل کے کچھ سچ چھپانا کس قدر مشکل ہو جاتا ہے۔ جس نگہت کی ہم سب مل کر مگنی اور شادی کے نام پر خوب کھپائی کیا کرتے تھے، اتنی کہ وہ اکثر رونے لگ جاتی تھی۔ آج اس کی ایک معصوم شرارت بھری مسکان نے مجھ سے میرا تمام اعتماد ہی چھین لیا تھا۔ شاید دل میں چور ہونا اسی کو کہتے ہوں گے۔

”کچھ نہیں۔۔۔۔۔ وہ دراصل میں۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے۔“

نگہت نے میری چوری پکڑ لی۔

”ہوں۔۔۔۔۔ تو یہ بات ہے۔۔۔۔۔ بھیا۔ دیکھیں اس کے ساتھ کوئی شرارت نہ کیجئے گا۔۔۔۔۔ وہ بہت بھولی بھالی سی سہیلی ہے میری۔۔۔۔۔ اور بہت مذہبی گھرانے سے تعلق ہے اس کا۔“

نگہت میری بہت سی سہیلیوں کے بارے میں جانتی تھی۔ وہ میری تمام دوستوں کو میری سہیلیاں ہی کہتی تھی۔ اور ایمان کے بارے میں میری پوچھ گچھ کو بھی میرے انہی پرانے معمولات میں سے ایک سمجھ رہی تھی۔ میں نے نگہت کا ہاتھ پکڑ کر اُسے وہیں اپنے پاس بٹھا لیا۔

”بیٹھو یہاں۔۔۔۔۔ اور غور سے میری بات سنو۔“

میں نے ”الف“ سے ”ی“ تک اب تک کی تمام کہانی نگہت کو سن وعن سنا دی۔ نگہت حیرت سے میری رام کھانتی رہی۔

”اب تم ہی بتاؤ، میں کیا کروں۔۔۔۔۔ میں بہت مشکل میں ہوں بگی۔۔۔۔۔“ ہوں۔۔۔۔۔ یہ تو خاصا گھمبیر معاملہ ہے۔۔۔۔۔ تو ایمان بی بی نے میرے پیارے بھیا کی نیندیں حرام کر رکھی ہیں۔۔۔۔۔ لیکن بھیا۔۔۔۔۔ آپ جیسا سمجھ رہے ہیں۔۔۔۔۔ وہ ویسی لڑکی نہیں ہے۔۔۔۔۔ ساری زندگی کسی نامحرم سے بات کرنا تو ذور کی بات ہے۔۔۔۔۔ اس پر ایسی کسی چیز کا سایہ تک نہیں پڑا۔ اپنی ساری تعلیم بھی اس نے پردے میں ہی حاصل کی ہے۔ اسے اپنی اور اپنے گھر کی عزت اپنی جان سے بھی پیاری ہے۔ محلے کا ہر گھرانہ اسے اپنی بہو بنانا چاہتا



صاحب سے بھی اجازت دلوا ہی دے گی چاہے اس کے لیے اسے خود مولوی صاحب کی منت ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ اس دن مجھے بھی اطلاع کر دی جائے گی اور نگہت چند لمحوں کے لیے میری ایمان سے تنہائی میں ملاقات کا بندوبست کروادے گی۔ میں جانتا تھا کہ نگہت کے لیے یہ سب کس قدر مشکل ثابت ہوگا لیکن میری محبت میں اس نے اپنی بچپن کی دوستی کو داؤ پر لگانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

طے یہ پایا کہ آنے والی جمعرات کو اس منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچایا جائے گا۔ لیکن میری وہاں سے واپسی تک نگہت نے ہزاروں بار مجھ سے تصدیق چاہی کہ میں کہیں ایمان سے فلرٹ تو نہیں کر رہا۔ کہیں وہ بھی کہیں میری بہت سی سہیلیوں کی بھیڑ میں کھو تو نہیں جائے گی۔ آخر کار مجھے اس کے کان پکڑ کر اُسے یقین دلانا پڑا۔ قصور اس کا بھی نہیں تھا اس کی بچپن کی سہیلی تھی ہی ایک ایسی گورنایاب۔۔۔۔۔ اس لمحے مجھے نگہت پر بے حد رشک بھی آیا۔ وہ کتنی آسانی سے اس مہر و اس گل رخ سے مل سکتی تھی، بات کر سکتی تھی اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام سکتی تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا میں گھنٹوں بیٹھا نگہت کے ساتھ ایمان کی باتیں کرتا رہوں۔۔۔۔۔ اس سے ایمان کی باتیں سنتا رہوں۔۔۔۔۔ محبت میں محبوب کا ذکر بھی کس قدر جاں فزا ہوتا ہے۔ بس اُس کے ذکر سے ہی بھوک پیاس مٹتی رہتی ہے۔ صدیاں گھڑیوں میں بیت جاتی ہیں۔ فضا یونہی خواہ مخواہ ہی دل کش لگنے لگتی ہے۔ آس پاس کا سبھی شور بھی جیسے نغموں میں ڈھل جاتا ہے۔ سخت جس زدہ پھیلی دھوپ میں بھی جیسے پردائیاں سی چلتی محسوس ہوتی ہیں۔ رات اور دن سب ایک خواب زدہ سی کیفیت میں گزرتے رہتے ہیں۔ ہونٹوں پر اپنے آپ ہی بنا کسی بات کے ایک خاص میٹھی سی مسکان پھیلی رہتی ہے۔ سب دشمن بھی دوستوں جیسے پیارے لگنے لگتے ہیں۔ جانے کیا کچھ ہونے لگتا ہے۔

میں بھی اگلی جمعرات کے آنے تک انہی سب محسوسات سے گزرتا رہا۔۔۔ کہتے ہیں ایک طرفہ عشق و سوسوں کا گھر ہوتا ہے۔ مجھے بھی اچانک عجیب سے دسو سے ڈسنے لگتے۔ پتہ نہیں وہ آ بھی پائے گی یا نہیں؟ کہیں مولوی صاحب منع ہی نہ کر دیں۔ وہ مجھ سے ملے گی بھی یا نہیں؟۔۔۔۔۔ جانے وہ میری اس کوشش کو کیا معنی دے گی۔۔۔۔۔؟

آخر جمعرات کا دن بھی آ ہی گیا۔ نگہت نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔

اس کے مطابق سہ پہر تین سے چار بجے کا وقت اس ملاقات کے لیے نہایت مناسب تھا۔ گرمیوں کی اس لمبی سہ پہر میں ہر طرف سناٹا ہی چھایا رہتا تھا۔ پلان کے مطابق مجھے دو بجے ہی پرانی حویلی پہنچ جانا چاہیے تھا۔ حویلی کے بڑے برآمدے کے ساتھ ہی۔ جہاں گرمیوں کے موسم میں دھوپ سے بچاؤ کے لیے بڑی بڑی چکیں تان دی جاتی تھیں، ایک بڑا سا کمرہ تھا جسے ہم ٹھنڈا کمرہ کہا کرتے تھے۔ اصل میں یہ کبھی دادا کی سٹڈی تھی۔ کمرے کی تعمیر میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا تھا کہ گرمیوں میں ہوا کے رخ پر ہولہذا شدید تپتی دو پہروں میں بھی یہ کمرہ ٹھنڈا رہتا تھا۔ اب بھی اس کمرے کے شیلف نادر کتب سے بھرے ہوئے تھے۔ مجھے یاد ہے بچپن میں گرمیوں کی لمبی لمبی سی دو پہریں ہم اسی کمرے میں اوندھے پڑے ٹارزن اور عمر و عیار کی کہانیاں پڑھتے ہوئے گزار دیتے تھے۔

نگہت نے ایک اور انکشاف بھی کیا تھا کہ ایمان کو اچھی کتابیں پڑھنے کا جنون تھا، اور اس معاملے میں وہ اکثر نگہت سے کتابیں مستعار لیتی رہتی تھی۔ نگہت نے اُسے میرے دادا کی اس اسٹڈی اور ان میں رکھی کتابوں کا بھی بتا رکھا تھا اور بقول نگہت، ایمان کو ان کتابوں کو ایک نظر دیکھنے کا بھی بے حد شوق تھا۔ لیکن زیادہ تر یہ اسٹڈی بند ہی رہتی تھی۔ آج میں خصوصی طور پر اسٹڈی کی چابی لے کر حویلی آیا تھا اور نگہت نے بھی ایمان کو اسٹڈی دکھانے کے بہانے ہی حویلی طلب کیا تھا۔ البتہ حیا کو وہ اعتماد میں لے چکی تھی کہ اصل میں مقصد میری ایمان سے ایک ملاقات کا اہتمام ہے۔

مجھے اسٹڈی میں ہی ان کا انتظار کرنا تھا۔ نگہت حیا اور ایمان کو لے کر اسٹڈی دکھانے آتی تو انہیں چند لمحوں میں مجھے ایمان سے اپنے دل کی بات کہنی ہوگی۔ اب یہ آگے میرا نصیب تھا کہ وہ میری بات سنتی، رد کرتی یا پھر غصے میں پلٹ جاتی۔۔۔۔۔ میں اسٹڈی میں اسی شش و پنج میں بیٹھا سامنے لگی لکڑی کی بڑی سی قدیم گھڑی کی سوئیاں گن رہا تھا۔ ابھی صرف دن کے ڈھائی بجے تھے اور مجھے یہاں پہنچے صرف آدھ گھنٹہ ہی ہوا تھا لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں جانے کتنی صدیوں سے یہاں بیٹھا ہوں۔ سٹڈی کے بڑے سے روشن دان میں چڑیوں نے اپنا گھونسل بنا رکھا تھا اور اس وقت چڑیا بھی اپنے بچوں سمیت اپنے گھونسلے میں سستا رہی تھی۔ روشن دان سے سامنے کی دیوار پر پڑتی دھوپ دھیرے



✓ لیا۔

”شاید تمھاری دوست کو میری یہاں موجودگی کچھ پسند نہیں آئی۔ میرا خیال ہے مجھے یہاں نہیں رکنا چاہیے۔“

ایمان نے گھبرا کر پھر سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ نگہت نے اُسے نظروں نظروں میں ہی گھورا، پھر جلدی سے بولی۔

”نہیں نہیں بھیتا۔۔۔۔ ہم تو دراصل یہاں کچھ پُرانی کتابیں دیکھنے آئے تھے۔ دراصل ایمان کو اچھی کتابیں پڑھنے کا جنون ہے نابس اسی لیے۔۔۔۔“

اب ایمان نے نگہت کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا، لیکن نگہت نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے رکھا۔

”ضرور۔۔۔۔ کیوں نہیں۔۔۔۔ آپ لوگ کتابیں دیکھئے۔۔۔۔ میں ابھی حاضر ہوا۔“  
میں جلدی سے اسٹڈی سے نکل گیا۔ مجھ میں اس کی جانب دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔ آج اُس نے کالے رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا اور کالے دوپٹے میں کچھ زیادہ ہی غضب ڈھا رہی تھی۔ رہ رہ کر میری آنکھوں میں اس کی لرزتی پلکیں اور کانپتے ہونٹوں کا منظر ابھر رہا تھا اور اس کی وہی ایک پریشان سی لٹ۔۔۔۔۔

باہر برآمدے میں کچھ دیر کھڑا میں اپنے حواس قابو میں لانے کی کوشش کرتا رہا۔ سارا معاملہ ہی الٹ پلٹ ہو گیا تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں کسی بہانے نگہت کو حیا سمیت چند گھڑیوں کے لیے باہر برآمدے میں بھیج دیتا اور ایمان سے بات کر لیتا لیکن اُسے دیکھ کر میں سب بھول کر خود ہی باہر نکل آیا تھا۔ مجھے اپنے اوپر شدید غصہ بھی آ رہا تھا۔ شاید اب دوبارہ اس سے بات کرنے کا کبھی موقع نہ مل سکے۔ شاید میں یہ بازی ہمیشہ کے لیے ہار چکا تھا۔

اتنے میں اسٹڈی کے دروازے کی طرف کچھ آہٹ ہوئی۔ میں نے چونک کر اوپر دیکھا۔ نگہت دروازے سے دبے پاؤں نکل رہی تھی۔ اس نے مجھے غصے سے بھرے اشاروں میں پوچھا کہ بھلا یہ کیا بات ہوئی؟ جواب میں میں صرف کاندھے اچکا کر ہی رہ گیا۔ پھر نگہت نے اندر حیا کو کچھ اشارہ کیا اور حیا بھی باہر نکل آئی۔ میں اب بھی گرم سم اور گنگ سا وہیں کھڑا تھا۔ نگہت آگے بڑھی اور میری کلامی تھام کر کھینچ کر مجھے اسٹڈی کے دروازے تک لے آئی

دھیرے سرک رہی تھی اور ڈھلتے ڈھلتے دیوار پر نئے زاویے بنا رہی تھی۔ کبھی کبھی یہ انتظار بھی کتنا جان لیوا ہوتا ہے۔ انسان کو اپنی سانسیں تک رکتی محسوس ہوتی ہیں۔ میں نے گھبرا کر آس پاس کی الماریوں میں لگی کتابوں کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔ لیکن حرف میری آنکھوں کے سامنے گڈ مڈ سے ہونے لگے۔ ہر آہٹ پر نہیں جیسے اچھل ہی تو پڑتا تھا، لیکن ہر آہٹ کے بعد باہر پھر سے طویل سناٹا چھا جاتا۔ گرمیوں کا مخصوص اور طویل سناٹا جس میں وقفے وقفے سے دور کسی درخت پر بیٹھے کوئے کی کانسیں کانسیں کے علاوہ اور کوئی بھی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ یا پھر حویلی کے باہر سے گزرتی لمبی کالی سنان سڑک پر کسی ٹانگے کی گزرنے کی آواز، یا پھر کسی موٹر گاڑی کی گھر گھر۔۔۔۔

وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔ آخر تین بج گئے، میرے دسو سے بڑھتے گئے۔ نہیں۔ وہ نہیں آئے گی۔۔۔۔ حیا نے اُسے نگہت کے سارے منصوبے کے بارے میں بتا دیا ہوگا۔ وہ نگہت سے بھی ناراض ہو گئی ہوگی۔ ہمیں ایسا منصوبہ بنانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ جانے وہ میرے بارے میں کیا سوچتی ہوگی۔ یہ سب غلطی ہی میری ہے۔

جانے دل میں کیسے کیسے وہم آنے لگے تھے۔ سواتین بجے تک تو میرا صبر بھی جواب دے گیا۔ میں نے گھبرا کر وہاں سے نکل جانے کا فیصلہ کر لیا۔ جیسے ہی میں نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے، دور برآمدے کے موڑ سے کچھ قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اور چند نسوانی ہنسی اور باتوں کے جلت رنگ سے دور سے بجتے سنائی دیئے۔ کوئی اس طرف آ رہا تھا۔ میری سانسیں رکنے لگیں۔ یہ تو اسی کے قدموں کی چاپ ہے۔۔۔۔۔ یا خدا۔۔۔۔۔ مجھے ہمت عطا کر۔۔۔۔۔

اچانک دروازہ کھلا اور سب سے آگے نگہت اور اس کے پیچھے ایمان اور اس کے پیچھے حیا مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔ نگہت نے مجھے دیکھ کر مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔

”السلام علیکم۔۔۔۔۔ ارے۔۔۔۔۔ حماد بھیتا آپ۔۔۔۔۔ یہاں۔۔۔۔۔ اس وقت؟“  
میری توقع کے عین مطابق ایمان کے چہرے پر گھبراہٹ اور سراسیمگی سی پھیل گئی۔ اُس نے بوکھلا کر میری طرف دیکھا اور فوراً جانے کے لیے پلٹی، لیکن حیا اس کے راستے میں اس کے پیچھے ہی کھڑی تھی لہذا اس کا راستہ رک گیا۔ نگہت نے بھی جاتی ایمان کا ہاتھ مضبوطی سے تھام



اور مجھے اندر دھکا دیتے ہوئے اُس نے دھیرے سے میرے کان میں کہا۔

”صرف تین منٹ۔۔۔۔“

میں گھبرایا ہوا سا نگہت کے دھکے کے زور میں اسٹڈی کے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ ایمان دُور آخری الماری کے قریب کھڑی کسی کتاب کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ آہٹ ہوئی تو اُس نے بے دھیانی میں پلٹ کر دیکھا۔ شاید اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ نگہت اور حیا دونوں خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئی ہیں اور ان کی جگہ اب میں دروازے پر کھڑا ہوں۔ گھبراہٹ کے مارے اس کے ہاتھ ہے کتاب نیچے گر گئی۔ اس نے سر کا پلو جلدی سے ٹھیک کیا اور باہر جانے کے لیے لپکی۔ لیکن اس کا سب سے بڑا مسئلہ اس وقت یہ تھا کہ اسٹڈی میں آنے اور جانے کا صرف ایک یہی بڑا سا دروازہ تھا جس کے پتوں بیچ میں اس وقت کھڑا تھا۔ جس قدر تیزی سے اُس نے قدم بڑھائے تھے۔ اتنی ہی جلدی اُسے رکنا بھی پڑا۔ بے بسی سے اس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ اور وہ سر جھکائے، بنا کچھ کہے کمرے کے بیچ و بیچ کھڑی تھی۔ شاید اُسے نگہت اور حیا پر بھی شدید غصہ آ رہا تھا اور ان کی منصوبہ بندی بھی اب اس کی سمجھ میں آ چکی تھی۔ چند لمحے ہم دونوں خاموش رہے اور صرف ہمارے درمیان موجود خاموشی بولتی رہی۔ مجھے اس کی سانسوں تک کی آواز اس سناٹے میں گونجتی محسوس ہو رہی تھی۔ پھر اُس نے اپنی ہمت مجتمع کی اور اس کی آواز کا سُر کمرے میں بکھرا۔ اس کے وجود کی طرح اس کی آواز بھی لرز رہی تھی۔

”میں باہر جانا چاہتی ہوں۔۔۔۔ آپ راستہ چھوڑ دیں۔“ میں نے پہلی مرتبہ اس کے منہ سے اتنے بہت سے لفظ اکٹھے سنے تھے۔۔۔۔ کچھ دیر تو میں بالکل مبہوت سا کھڑا رہا۔ پھر یکا یک جیسے مجھے ہوش آیا۔

”آپ کا راستہ اس طرح روکنے کی معافی چاہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے میری یہ حرکت تمام عمر کے لیے مجھے آپ کی نظروں سے گرا دے۔۔۔۔ لیکن یقین جانئے۔۔۔۔ میں نے بہت مجبور ہونے کے بعد یہ قدم اٹھایا ہے۔۔۔۔ پلیز۔۔۔۔ مجھے غلط نہ سمجھئے۔“

”آخر آپ چاہتے کیا ہیں۔ مجھے جانے دیجئے۔۔۔۔ خدا کے لیے۔“

اُس کی آواز اب بھرانے لگی تھی۔ آنسوؤں کا ارتعاش اس کی پلکوں کے گرد جمع ہو کر

پھٹنے کو بے تاب ہو رہا تھا۔

”میں صرف آپ سے اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ جب سے میں نے آپ کو دیکھا ہے۔

پھر آپ میرا اپنا نہیں رہا۔ میرے پاس شاید وہ لفظ ہی نہیں ہیں جن سے میں اپنی کیفیت آپ پر ظاہر کر سکوں۔۔۔۔ میرے جذبے کے لیے اس وقت دنیا کی سبھی ڈکشنریوں میں موجود ہر لفظ مجھے عامیاناہ لگ رہا ہے۔ شاید میرا یہ طریقہ بھی بے حد عامیاناہ اور ہلکا ہے لیکن میں کیا کروں۔۔۔۔ میرے پاس اور کوئی ذریعہ تھا بھی نہیں۔ یہ میری اور میرے دل ل شدید مجبوری ہے جس نے مجھے آپ تک اپنی بات پہنچانے کے لیے ایسا گرا ہوا راستہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔۔۔۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دیجئے گا۔“

وہ اب بھی یونہی خاموش سی سر جھکائے کھڑی نیچے نیچے قالین میں نظریں گاڑے ہوئی تھی۔ اس نے پھر وہی بات دُہرائی۔

”آپ نے اپنی بات کہہ دی۔۔۔۔ اب مجھے جانے دیں۔۔۔۔ میں آپ کی منت لی ہوں۔“

”مجھے آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔“

میں اس کے راستے سے ہٹ گیا۔ وہ ہوا کے ایک جھونکے کی طرح وہاں سے اپنا الگ وجود سنبھالتی ہوئی نکل گئی۔ بس اس کی خوشبو کمرے میں بکھری رہ گئی۔ میں نے باہر آمدے کی طرف اسٹڈی کی کھلنے والی کھڑکی میں اُسے جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ نگہت، میا کے پاس رُکے بغیر آگے بڑھ گئی۔ نگہت اُسے آوازیں دیتی ہوئی اس کے پیچھے بھاگی۔ حیا کی نظر کھڑکی سے ہوتی ہوئی مجھ پر پڑی اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ اس نے کمرہ میں مجھے آداب کیا اور پھر وہ بھی ایمان کے پیچھے بھاگ گئی۔ مجھے اس لمحے حیا بہت لگی۔ اس لڑکی نے ایک انجانے انسان پر اعتبار کر کے اپنی جان سے پیاری بہن کو اس لئے بھیج دیا تھا۔ جانے نگہت نے اُسے کس طرح میرا اعتبار دلایا ہوگا۔ بہر حال جو بھی تھا، اہل لال تو نگہت اور حیا دونوں کی ہی خیر نہیں تھی۔ ظاہر ہے ایمان ان سے شدید ناراض ہو گئی گی۔ بانے اب وہ دونوں اسے کس طرح منائیں گی۔

میں بہت دیر تک اس کمرے میں یونہی سحر زدہ سا بیٹھا رہا۔ جانے کیوں وہاں سے



بے چینی سے اس کے اعلان کی دعائیں کر رہے ہیں، وہ فیصلہ اعلان ہونے کے بعد جب واقعی ان کے حق میں نہیں ہوگا تو تب ان کا کیا حشر ہوگا۔۔۔۔؟

میری کیفیت بھی کچھ ایسی ہی تھی اس رات۔ مجھے ایمان کے فیصلے کا انتظار تھا اور میں ایک ایسے کرب سے گزر رہا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو، بس مجھے جلد از جلد اس کا فیصلہ سنائی دے دیا جائے۔ شاید اس جلد بازی میں میرے دل کی ایک اور چوری تمنا کا بھی عمل دخل تھا۔ میرا دل اس وقت کسی طور بھی اس دلبر کی طرف سے کسی رابطے، کسی کلام کی خواہش میں پھل رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس کے ہونٹوں پہ بس میرا نام آئے۔۔۔۔ چاہے، برسر الزام ہی آئے۔ جانے عشق میں یہ دل ایک چھوٹے بچے کی طرح کیوں برتاؤ کرنے لگتا ہے۔ عشق میں دل کو صرف اسی پل، اسی لمحے، اسی دن کی فکر ہوتی ہے جو گزر رہا ہوتا ہے۔ مستقبل کا ڈر، خوف یا دوسو سے اس سے کوسوں دور ہوتے ہیں۔ عشق کو بس حال سے غرض ہوتی ہے۔ عشق انجام سے بے خبر اور لا تعلق ہوتا ہے۔

جانے وہ رات کیسے ڈھلی اور کب صبح ہوئی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اڑ کر نگہت کے پاس پہنچ جاؤں اور اس سے کل کی تمام روداد پوچھوں، کرید کرید کر سوال کروں، لیکن روز روز یوں پرانی حویلی جانا بھی تو کچھ ٹھیک نہ تھا۔ نگہت میری منہ بولی بہن ہی سہی لیکن آس پاس حویلی کے دوسرے نوکر چاکر بھی تو تھے۔ جانے وہ میرے روز روز کے یوں وہاں آنے اور نگہت سے تنہائی میں ملنے کو کیا رنگ دیں۔ پھر میں نے خود ہی ان فضول خیالات کو سر سے جھٹک دیا۔ یہ میں کیا سوچ رہا تھا، یہ بے بنیاد سے وہم میرے اندر کہاں سے پلنے لگے تھے۔۔۔۔؟ شاید محبت انسان کو اپنے اوپر شک کرنا بھی سکھا دیتی ہے۔

ساڑھے گیارہ بجے شاکر مجھے ڈھونڈتا ہوا میرے کمرے تک آئے۔ میں ابھی تک کمرے میں ہی بند تھا صبح سے، شاکر نے مجھے نگہت کا دیا ہوا ایک بند لفافہ تھمایا اور حسب معمول پوچھا۔۔۔۔۔ ”بابا۔۔۔۔۔ کل آپ حویلی گئے تھے۔۔۔۔۔ کچھ کام تھا کیا۔۔۔۔۔؟“

حالانکہ شاکر نے اپنے معمول کے مطابق عام سا سوال ہی کیا تھا لیکن جانے کیوں میں گڑبڑا سا گیا۔۔۔۔۔ ”ہاں۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ کچھ خاص نہیں۔۔۔۔۔ نگہت سے کچھ کتابیں نکالنے کا کہا تھا سٹڈی سے۔۔۔۔۔ وہی لینے گیا تھا۔“

باہر جانے کے لیے میرا دل ہی نہیں مان رہا تھا۔ میں نے بار بار اس منظر کو آنکھیں بند کر کے محسوس کرنا چاہتا تھا جب وہ ناز پیکر یہیں اس کمرے میں سر جھکائے میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کا نازک وجود کسی پتے کی طرح لرز رہا تھا، اور وہ مجھ سے ہم کلام تھی۔

دھوپ ڈھل چکی تھی اور آب روشن دان سے اندر چھننے والی روشنی میں وہ حدت باقی نہیں تھی۔ میری گھڑی پر نظر پڑی تو شام کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ بادل خواستہ میں وہاں سے اٹھا۔ اچانک میری نظر اس کتاب پر پڑی جو ایمان کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گئی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر کتاب اٹھالی۔ بانو قدسیہ کی ”رابعہ گدھ“ تھی۔ اچانک میری نظر کتاب کے پاس ہی پڑے دو چھوٹے سے موتیوں پر پڑی۔ ایسے موتی تو میں نے ایمان کے سینڈلز میں لگے دیکھے تھے۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ مجھ سے بات کرتے ہوئے اس کی نظر پورا وقت زمین میں گڑی ہوئی تھی اور میری نظر بھی اس کے نظر کے تعاقب میں اس کے قدموں کی طرف کئی بار اٹھی تھی۔ ضرور جب اس کے ہاتھ سے کتاب گری ہوگی تو اس کے قدموں سے نکرائی ہوگی۔ تبھی یہ موتی علیحدہ ہو کر گر پڑے ہوں گے۔ میں نے وہ دونوں موتی اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیے۔

اب نگہت کا انتظار کرنے کا فائدہ نہیں تھا۔ مجبوراً میں ٹوٹے قدموں سے وہاں سے نکل آیا۔ رات بھر میری پلکوں تلے وہ سارے منظر کسی فلم کی طرح چلتے رہے۔ میری حالت اس نالائق طالب علم کی سی تھی جو پرچے میں ایک بھی سوال ٹھیک طرح سے حل کر کے نہ آیا ہو لیکن پھر بھی اسے نتیجے کا بے چینی سے انتظار ہو۔

کبھی کبھی ہم زندگی میں کچھ ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں ہمیں نتیجے کی کیفیت سے زیادہ نتیجہ کا پتہ چل جانے کی جلدی ہوتی ہے۔ ہمیں اس بات سے فرق نہیں پڑتا کہ فیصلہ ہمارے حق میں ہوگا یا مخالفت میں، بس فیصلہ ہو جانے کی تمنا ہوتی ہے۔ عام طور پر ایسا کمزور اعصاب والوں کے ساتھ ہوتا ہے جو انتظار کی اذیت اور جیھن کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتے۔ اور ذہنی دباؤ کے ہاتھوں تنگ آ کر دھائی دینے لگتے ہیں کہ بس جو بھی ہونا ہے۔ آج ہی ہو کر رہے۔ ایسے لوگ اس وقت اس بات سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں کہ جس نتیجے اور جس فیصلے کا اپنی مخالفت میں طے ہو جانے کا خیال ہی انہیں اس قدر ہلکان کر رہا ہے کہ وہ



شا کر نے مشکوک نظروں سے میری طرف دیکھا۔  
 ”دیکھیں حماد بابا۔۔۔۔ اگر آپ نے نگہت کو مزید نئی کتابیں دوائیں تو میں بہت ناراض ہو جاؤں گا۔ ضرور اس نے اس لفافے میں نئی کتابوں کی فہرست بھیجی ہوگی۔“  
 مجھے شا کر کے انداز پر ہنسی آ گئی۔ جانے وہ کیا سمجھ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے اُسے یقین دلایا کہ میں اس مہینے میں نگہت کو مزید کوئی کتاب نہیں دواؤں گا۔ شا کر کے جاہتے ہی میں نے بے تابی سے فوراً لفافے کو چاک کیا اور اندر سے نگہت کا خط نکالا۔ میری بے چین نظریں خط پر پھسلنے لگیں، لکھا تھا۔  
 ”بھیا جی۔۔۔۔“

مُرا پھنسا یا آپ نے، وہ مجھ سے روٹھ گئی ہے۔ بہت ناراض ہو کر مئی ہے یہاں سے۔ اپنی چھوٹی بہن سے بھی بات نہیں کر رہی تھی۔ میں نے آپ کو کہا تھا نا کہ وہ اس بات کو پسند نہیں کرے گی۔۔۔۔ بہر حال جو ہو اسو ہو۔۔۔۔ آج میں اُس کے گھر جاؤں گی اور میں اور حیا اُسے مل کر منا ہی لیں گے۔۔۔۔ لیکن آپ کے مقدمے کا کیا فیصلہ دیتی ہے۔ یہ اب خدا ہی جانے۔ میری مانیں تو آپ اپنے گھر والوں سے بات کر کے اُس کے گھر بھیجیں۔۔۔۔ اس سے آپ کی سچائی بھی اس پر واضح ہو جائے گی، ورنہ وہ ان لڑکیوں میں سے نہیں ہے جو بنا کسی رشتے کے ایسا کوئی تعلق جوڑے۔۔۔۔ خوش رہیں۔“

اس چھوٹے سے خط میں نگہت نے وہی سب کچھ لکھا تھا جس کی میں توقع کر رہا تھا۔ لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں میں وہ چند سطور پڑھ کر بے حد اُداس اور پہلے سے کہیں زیادہ بے چین ہو گیا۔ وہی ہوا، پہلے نتیجہ آنے کی بے چینی تھی اور اب فیصلہ سننے کے بعد کی بے تابی۔ نا اس کروٹ چین تھا، نہ اُس کروٹ آرام۔

لیکن انسان کی فطرت میں قدرت نے اُمید اور آس کی ڈور سے ہمیشہ بندھے رہنے کا ایک عجیب سا انتظام کر رکھا ہے۔ ایک ڈور ٹوٹتی ہے تو وہ دوسری تھام لیتا ہے۔ دوسری ٹوٹتی ہے تو تیسری۔۔۔۔ یوں یہ سلسلہ اس کی سانس کی ڈور ٹوٹنے تک چلتا ہی رہتا ہے۔ شاید

قدرت نے انسان کی طبیعت میں یہ آس اور اُمید کا سلسلہ نہ رکھا ہوتا تو وہ پہلی نا اُمیدی پر ہی لقمہ ہو جاتا، مایوسی سے مر جاتا۔

میں بھی ایک نئی آس اور اُمید میں مبتلا ہو گیا کہ نگہت اور حیا جب اس مہینے میں کو منالیں گے تو شاید تب اُسے میرے حال پر کچھ رحم آ جائے۔۔۔۔ شاید وہ کچھ کہے۔

اب میری دھڑکنوں کو اس کی طرف سے کسی پیغام کا انتظار تھا۔ مجھے اس انتظار کی سولی پر ابھی مزید کچھ روز ٹلنا تھا۔۔۔۔



یہاں سکون کی تلاش میں آئے ہو۔ میں تو کہتا ہوں چھوڑو یہ پڑھائی وڑھائی کا چکر، میں بھی کچھ دن آف لیتا ہوں اور نکلتے ہیں سونٹرز لینڈ کی طرف۔ کچھ نئی محبتوں کی تلاش میں۔۔۔۔۔ ہل۔۔۔۔۔ کیا بولتا ہے۔“

میں جانتا تھا کامران کس قسم کی نئی محبتوں کی تلاش میں نکلنا چاہتا تھا۔ ”سدھر جاؤ مسٹر کامران۔ تمہاری اپنی حرکتوں کی وجہ سے تین لڑکیاں باقاعدہ سال سال تک تمہاری منگیتر رہنے کے بعد تمہیں چھوڑ کر جا چکی ہیں اب تک، اب کیا ڈبل ہیٹ ٹرک کا ارادہ ہے۔“

ہم چوک پر بنے ہوئے بڑے سے فوارے کے پاس پہنچ چکے تھے جس کے درمیان ایک بڑے سے لوہے کے بنے شیر کے منہ سے خون کی دھاروں کی بجائے پانی کی پھواریں اُبل رہی تھیں۔ البتہ اس وقت شدید سردی کی وجہ سے دو چار دھاریں جم کر باقاعدہ برف کی ہتلی کمانوں کی شکل اختیار کر چکی تھیں۔ آخری ٹرام نکلتے ہی والی تھی۔ ہم دونوں باقاعدہ دوڑتے ہوئے پیلے رنگ کی ٹرام جس پر بڑی سے لال لیکریں ڈلی ہوئی تھیں، میں سوار ہو گئے۔ اندر ایک جیسی عجیب سے گھاگھرا نما لباس میں باقی لوگوں کے ساتھ بیٹھیں ہوئی تھی۔ وہ کامران کو اور کامران اُسے دیکھ کر مسکرایا۔ میں نے حیرت سے کامران کی طرف دیکھا۔

”تم اسے جانتے ہو۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ لیکن کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ تو مجھے جانتی ہے، تبھی تو مجھے دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔“ اتنے میں جیسی نے والہانہ انداز میں ہاتھ پھیلائے اور کامران کی طرف بڑھی۔ کامران کے دل کی کلی کی طرح اس کا چہرہ بھی کھل گیا اور اس نے بھی ہاتھ پھیلا دیے۔ جیسی ہم دونوں کے درمیان میں سے ہوتی ہوئی ہمارے پیچھے کھڑے لمبے بالوں والے ایک میلے۔۔۔۔۔ ہی کے گلے جا لگی، کامران ویسے ہی بازو پھیلائے کھڑا رہ گیا۔ مجبوراً مجھے ہی اسے گلے لگانا پڑا۔ چند لمحے تو وہ حیرت اور غصے کے عالم میں ہی گنگ سا کھڑا رہ گیا اور پھر ہم دونوں ہی لڑکھارے مار کر ہنس پڑے۔ ٹرام اپنی مخصوص دھیمی سی رفتار سے اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی۔

کچھ لوگ محبت کو زندگی میں سب سے خالص جذبہ سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں سچی محبت سے زیادہ خالص جذبہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ اتفاق سے میں اور کامران دونوں ہی

## زرد لندن

لندن کی شام اگر دن بھر دھوپ نکلنے کے بعد ہو تو شاید ہی اس سے حسین شام دنیا کے کسی اور خطے پر اُترتی ہوگی۔ اور اگر موسم خزاں کا ہو تو پھر تو سونے پہ سہاگہ والی بات ہوتی ہے۔ وہ بھی ایک ایسی ہی شام تھی۔ آسمان پر شفق کی سُرخ کاری کا رنگ تھا اور زمین پر خزاں میں جلے سُرخ پتوں نے جیسے اک آگ سی لگائی ہوئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی مصور نے صرف سُرخ اور زرد رنگ کی آمیزش سے کینوس پر ایک خوبصورت تصویر بنا ڈالی ہو۔

میں اور کامران اس روز ہائیڈ پارک سے شہر کی طرف جاتی ہوئی سنان سڑک پر چہل قدمی کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ سڑک دونوں طرف سے گھنے پتیل کے درختوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ جس کے خزاں رسیدہ پتے ہوا سے ہمارے سروں پر یوں گر رہے تھے جیسے کسی دو لمبے کے سہرے پر پھول نچھادر کیے جاتے ہیں۔ سردی کی شدت نے ہم دونوں کو اپنے اپنے اور کورٹ گلے تک بند کرنے اور ان کے کالر اٹھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ سڑک کے کنارے جمی ہوئی برف کے ڈھیر دھیرے دھیرے پکھل کر ساتھ بنی لوہے کی جالیوں سے ڈھکی تالیوں میں ایک مدھم سے شور کے ساتھ گر رہے تھے۔ قریب ہی ایک جوڑا سردی سے بے نیاز، وہاں کھڑی آئس کریم گاڑی سے اپنی پسند کی کون آئس کریم بنوا رہا تھا۔ سچ ہے، آئس کریم کھانے کا مزہ تو شدید سردی میں ہی آتا ہے۔ لڑکی اپنے لباس میں خود بھی اس وقت کوئی رنگ برنگی آئس کریم ہی لگ رہی تھی۔ لڑکے نے اُسے کیا کہا، دونوں ایک ساتھ زور سے ہنسنے۔ کامران نے حسب معمول بُرا سا منہ بنایا اور لندن کی تمام حسین اور جوان لڑکیوں کی عقل کا ماتم کیا۔ دُور کہیں سورج ڈھل رہا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ یہ سڑک ہمیں سیدھے اُس دُوبتے سورج کے گولے کی طرف ہی لے جا رہی ہو۔

”کچھ بھی ہو یا رمیڈی۔۔۔۔۔ مجھے اس یہودن کے ارادے کچھ ٹھیک نہیں لگتے۔ تم



اس نظریے سے متفق نہ تھے۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس معاملے میں بھی ہم دونوں کے نظریات ایک دوسرے سے قطعی مختلف تھے۔

میں نفرت کو دنیا کا سب سے مکمل اور خالص جذبہ سمجھتا تھا، محبت میں تو پھر بھی کہیں کچھ ملاوٹ، کچھ کھوٹ ہو سکتا تھا، لیکن نفرت بنا کسی کھوٹ اور ملاوٹ کے ہوتی ہے۔ بالکل اصلی، شدید اور خالص۔۔۔۔۔ جب کہ کامران کے خیال میں ”ہوس“ دنیا کا سب سے سچا جذبہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ انسان صرف ہوس کے معاملے میں ہی خالص اور سچا ہوتا ہے۔ باقی سب جذبوں میں وہ کہیں نہ کہیں ڈنڈی مار ہی جاتا ہے۔ چاہے محبت ہو یا چاہے نفرت لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ چاہے محبت ہو یا نفرت، چاہے عشق ہو یا پھر صرف ہوس۔۔۔۔۔ کبھی کبھی تو مجھے یہ چاروں ایک ہی جذبے کے چار رخ دکھائی دیتے تھے۔ محبت کی بنیاد پر نفرت کرنے والے یا عشق کی سچائی ثابت کرنے کے لیے اپنی ہوس چھپانے والے مجھے ہمیشہ ہی سے منافق لگتے تھے۔ کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ کھلے عام ہوس کا رشتہ رکھنے والے ہی اصل میں بہادر اور سچے لوگ ہوتے ہیں۔ شاید ہوس ہی دنیا کا ازلی اور شاید ابدی رشتہ ہوتا ہے۔ اور ہم سب بھی ایسے ہی کسی رشتے کی پیدوار ہیں۔

کامران نے رات سونے سے پہلے پھر مجھے سر آ نرک کی بیٹی مس پیریز کے ساتھ اُلجھنے سے منع کیا۔ دراصل اسے بچپن سے میری ایک خاص عادت کا بہت اچھی طرح سے اندازہ تھا۔ میں کسی ایک خاص حد تک ہی چیزوں کو ٹال پاتا تھا۔ اس کے بعد اگر وہ معاملہ میرے دماغ کی رگوں پر سوار ہونے لگتا تو پھر میں اپنے نفع و نقصان کا احساس بھلا کر اس معاملے کو سدھارنے کے پیچھے پڑ جاتا تھا۔ کامران جانتا تھا کہ میں یہاں اپنے ماضی کی پرچھائیوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے آیا ہوں لہذا وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ میں کسی بھی قسم کا تناؤ برداشت کروں۔

لیکن شاید قدرت اس وقت کامران کی خواہش کے حق میں نہیں تھی۔

اگلی صبح میری پہلی مذہبیٹری مس پیریز سے ہو گئی۔ یونیورسٹی کے احاطے میں جوزف ندی کنارے اپنی پسندیدہ جگہ پر کھڑا پرندوں کو چارہ ڈال رہا تھا۔ اُس نے مجھے دُور سے آتے دیکھا تو وہیں سے ہاتھ کے اشارے سے مجھے قریب بلانے لگا۔ میری کلاس میں ابھی

کچھ وقت باقی تھا۔ سوچا دو گھڑی جوزف سے ہیلو ہائے کر لوں۔ میں جوزف کی طرف بڑھنے کے لیے جیسے ہی لکڑی کے بنے ہوئے اس پل پر چڑھا جو ندی کے دونوں کناروں کو ملانے کے لیے بنا ہوا تھا۔ تو اچانک دوسری طرف سے سارہ اپنے چار دوستوں کے گینگ کے ہمراہ اس پل پر چڑھ آئی۔ اس کے دوستوں میں دو لڑکے اور دو لڑکیاں شامل تھیں اور یہ سب میری ہی کلاس کے اسٹوڈنٹ تھے۔ سارہ نے قریب سے گزرتے ہوئے عبرانی زبان میں کچھ کہا۔ وہ شاید اس بات سے بے خبر تھی کہ متروک زبانیں کبھی میری خاص دلچسپی کا حامل ہوا کرتی تھیں۔ جیسے لوگوں کو ٹکٹ جمع کرنے، سکے اکٹھے کرنے مصوری کرنے کا شوق ہوتا ہے، اسی طرح کبھی میرا واحد شوق دنیا کی پرانی زبانوں کے بارے میں جاننا تھا۔ یہ شوق مجھے دادا جان سے منتقل ہوا تھا۔ ہماری پرانی حویلی کی لائبریری اور سٹڈی میں اب بھی اس طرح کی کئی قدیم کتابوں کے نسخے محفوظ تھے۔ جن میں توریت اور زبور کے قدیم نسخے بھی شامل تھے۔

اسی لیے مجھے سارہ کی کہی ہوئی بات سمجھ میں آ گئی۔ اُس نے میرے مذہب کے بارے میں کوئی غلط بات کہی تھی۔ لیکن انگریزی کے بجائے عبرانی زبان اس نے شاید اس لیے استعمال کی تھی کہ مقصد شاید مجھے چوٹ پہنچانے سے زیادہ اپنے دوستوں سے داد وصول کرنا تھا۔ میں بھی اتنی عبرانی تو بول ہی سکتا تھا، سو میں نے بھی عبرانی میں ہی اُسے جواب دیا۔

”کوئی مذہب کسی دوسرے کے مذہب پر کچھڑا چھالنے کی اجازت نہیں دیتا، اور کچھڑا اُچھالنے والے دراصل خود اپنے مذہب کو ہی گالی دے رہے ہوتے ہیں۔“

میری بات سنتے ہی چند لمحوں کے لیے سارہ گنگ سی رہ گئی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ میں اس کی بات سمجھ جاؤں گا۔ نہ صرف سمجھوں گا بلکہ اُسے اس کی زبان میں ہی جواب بھی دوں گا۔ اس کے گروپ میں سے ایک لڑکا جو شاید عبرانی نہیں جانتا تھا جلدی سے مارہ کے قریب آیا اور اُس سے پوچھنے لگا کہ میں نے اس سے کیا کہا ہے۔ سارہ اب بھی خاموش کھڑی تھی۔ میں آگے بڑھنے لگا۔ دوسرا لڑکا میرے راستے میں آکھڑا ہوا اور میرا راستہ بند کر دیا۔ چند لمحے ہم ایک دوسرے کے سامنے کھڑے خاموشی سے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اک دو جے کو گھورتے رہے۔



بھی جھلک نہیں ہے۔ اور یہی بات ان سب کو کھلتی ہے۔ جو شخص ان سے مرعوب نہ ہو۔ ان کے سامنے تن کر چلے۔ یہ بھلا اُسے کہاں برداشت کر سکتے ہیں۔“  
مجھے غصہ آ گیا۔

”مرعوب ہونے یا ان سے دبنے کی کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیے۔۔۔ میں کسی خیراتی سکارل شپ پر تو یہاں آیا نہیں ہوں۔ ہزاروں پونڈ فیس بھری ہے۔ اس یونیورسٹی کا میرٹ ٹیسٹ پاس کیا ہے۔ بلکہ میں شاید یہاں پر موجود ہر اسٹوڈنٹ سے زیادہ ڈونیشن اور فیس دیتا ہوں کیونکہ مجھے اپیشل سیٹ پر یہاں داخلہ دیا گیا ہے۔ پھر بھلا میں کسی کے رُعب میں کیوں آؤں؟“  
”تمہارے اسی ڈونیشن اور تمہاری اسی بھاری فیس نے ان یہودی ساہوکاروں کے منہ بند کر رکھے ہیں۔ تم ان کے لیے ایک سونے کی کان ہو جسے یہ اپنی انا کے ہاتھوں کھو نہیں سکتے۔۔۔۔۔ رُامت ماننا۔۔۔۔۔ یہ تمہاری قابلیت نہیں تھی جس کی وجہ سے تمہیں یہاں داخلہ ملا۔۔۔۔۔ بلکہ وہ تمہاری بینک بیلنس کی شیٹ جو تمہارے ریکارڈ کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔ اُس نے تمہیں اس یونیورسٹی تک پہنچایا ہے۔“  
میں نے حیرت سے جوزف کی طرف دیکھا۔

”یہ سب آپ کو کیسے پتہ چلا؟“

”تم نے شاید غور نہیں کیا۔۔۔۔۔ یہاں گئے چنے مسلمان اسٹوڈنٹ ہیں۔ ان میں سے بھی زیادہ تر برائے نام مسلمان ہیں۔ جو یہاں کی تہذیب میں رل مل کر اپنا اور دوسروں کا فرق منا چکے ہیں۔ باہر سے صرف تمہی ہو۔ یہ یونیورسٹی داخلہ دیتے وقت سات شجروں تک مسب نب کھنگالنے کی عادی ہے۔ ہو سکتا ہے تمہارے شجرہ نسب میں انہیں کوئی قابل فکر چیز بھی نہ ملی ہو۔“

میں نے چونک کر جوزف کی جانب دیکھا، یہ بات تو اس نے چاہے انجانے میں ہی کہی۔ لیکن بالکل ٹھیک کہی تھی۔ میرے دادا، پردادا برٹش گورنمنٹ کے خاص وفادار اور وظیفہ دار رہ چکے تھے، ہماری سات نسلوں میں کوئی باغی پیدا نہیں ہوا تھا۔

میں نے غور سے جوزف کو دیکھا۔

”لیکن آپ مجھے یہ سب کچھ کیوں بتا رہے ہیں۔ آپ بھی تو اسی یونیورسٹی کی انتظامیہ

جوزف جواب تک دُور کھڑا یہ سارا ماجرا دیکھ رہا تھا۔ شاید معاملے کی سنگینی کو بھانپ گیا، اسی لیے وہ تیز تیز قدموں سے ہماری طرف چلا آیا اور دُور ہی سے چلا کر کہنے لگا ”ہے حماد میں تم کہاں ہو۔۔۔؟ جلدی یہاں آؤ۔۔۔۔۔ مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔“  
جوزف چونکہ اسی یونیورسٹی کا ایک نیچر تھا لہذا اُس کے سامنے ان لڑکوں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ میں بھی سامنے کھڑے لڑکے کو ہٹا کر جوزف کی طرف بڑھ گیا۔ سارہ کا گروپ بھی دوسری جانب چلا گیا۔

جوزف نے پریشانی سے مجھے دیکھا۔

”کیا کہہ رہے تھے یہ لوگ تمہیں۔“

”کچھ نہیں۔۔۔ میں نہیں جانتا تھا کہ نائن الیون کے بعد یہ مذہبی تعصب ان بڑی یونیورسٹیوں تک پھیل چکا ہے۔“

”ان لوگوں سے نہ ہی اُلجھو تو بہتر ہے۔ یہ سب ہی یہاں کے اُدبے درجے کے یہودی امراء کے بچے ہیں۔ تمہارے لیے کسی بھی وقت کوئی مصیبت کھڑی کر سکتے ہیں۔“  
میں اور جوزف چلتے ہوئے اپنے مخصوص بیچ پر جا بیٹھے۔ ہمارے ارد گرد کبوتروں کا ایک غول دانہ چک کر ایک زوردار آواز کے ساتھ اُڑا رہی بھر گیا، اور اس کی جگہ نئے کبوتروں نے لے لی۔

”میں کسی سے اُلجھنا نہیں چاہتا۔ لیکن جانے یہ لوگ کیوں ہر بار میرا راستہ کاٹ جاتے ہیں۔ جانے انہیں مجھ سے کیا پر خاش ہے۔“

جوزف نے خاکی کاغذ کے لفافے سے کبوتروں کا دانہ نکال کر فضا میں اُچھال دیا۔  
”میں جانتا ہوں تم اپنے کام سے کام رکھتے ہو، نہ ہی تم نے کبھی ان لوگوں سے از خود اُلجھنے کی کبھی کوئی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ لوگ اس یونیورسٹی کو اپنی ملکیت سمجھتے ہیں اور یہاں کے اسٹوڈنٹس کو اپنی رعایا۔ اور تم رعایا کے جملہ حقوق پر پورے نہیں اُتر رہے۔“

”کیا مطلب۔۔۔۔۔ رعایا کے جملہ حقوق پر کیسے پورا اُترا جاسکتا ہے۔“

”در اصل تمہارے انداز میں، تمہاری چال ڈھال میں اور تمہارے بات کرنے کے انداز میں ایک خاص متانت، ایک خاص غرور سا ہے۔ تمہاری شخصیت میں مرعوبیت کی ذرا



کا ایک حصہ ہیں۔ پھر انتظامیہ کے یہ راز مجھ پر کیوں کھول رہے ہیں۔“  
جوزف مسکرایا۔

”میں خود بھی اس بات پر کبھی کبھی بہت حیران ہوتا ہوں کہ آخر تم میں ایسی کیا بات ہے جو اپنا اپنا لگنے پر مجبور کرتی ہے۔ تم اوروں سے مختلف کیوں دکھتے ہو؟۔۔۔۔۔ شاید اس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ تم نے کبھی ٹوٹ کر کسی سے محبت کی ہے۔۔۔۔۔ اور میرے دل میں محبت کرنے والوں کا بہت اونچا مقام ہے۔۔۔۔۔ بہت اونچا۔“

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

”گویا آپ نے بھی کسی سے کبھی محبت کی ہے۔۔۔۔۔؟ لیکن آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ میں نے کبھی ٹوٹ کر کسی کو چاہا ہوگا۔۔۔۔۔؟ ہو سکتا ہے میں محبت کے نام سے بھی واقف نہ رہا ہوں۔“

”ناممکن۔۔۔۔۔ تمہاری آنکھیں کبھی جھوٹ نہیں بول سکتیں۔۔۔۔۔ ان کی گہرائی میں محبت کے کتنے راز، کتنے درد چھپے ہیں۔۔۔۔۔ یہ شاید تم خود بھی نہیں جانتے۔۔۔۔۔ محبت انسان میں ٹھہراؤ لے کر آتی ہے۔۔۔۔۔ وہ اوپر سے جتنا سکون نظر آتا ہے، اندر سے اتنا ہی بے چین ہوتا ہے۔۔۔۔۔ تم بھی ایک ایسا ہی خاموش اور پرسکون سمندر ہو۔۔۔۔۔ جو اپنے اندر ہزاروں طوفان چھپائے بیٹھا ہے۔“

میں نے ایک لمبی سی سانس لی۔۔۔۔۔ تو گویا اب یہ دل کے راز میرے چہرے سے بھی عیاں ہونے لگے تھے۔۔۔۔۔ کہاں جاؤں۔۔۔۔۔؟ کیسے چھپاؤں اپنے اس کرچی کرچی دل کے آئینے کو۔۔۔۔۔؟

میں اور جوزف یونہی خاموش بیٹھے رہے۔ ہمارے سامنے نہر میں پانی بہنے سے فضا میں اک ہلکا سا ارتعاش پیدا ہو رہا تھا۔ ہمارے آس پاس کبوتروں اور دانے چگتے پرندوں کی ملی جلی آوازیں تھیں۔ سرد ہوا میری آنکھوں سے ٹکرائی تو مجھے پتہ چلا کہ میری آنکھوں کے گوشے بھیگ چکے ہیں۔ میں نے کوٹ کی جیب سے گہرا کالا چشمہ نکال کر پہن لیا۔ دل کے راز جب دل میں ہی رہیں تو اچھا ہوتا ہے۔۔۔۔۔ لیکن جب یہ آنکھوں سے بہہ کر چھلکنے لگیں تب ان پر پردہ ڈال لینا ہی بہتر ہوتا ہے۔

## محبت کی دو پہر

محبت انسان پر دھوپ کی طرح دھیرے دھیرے اترتی ہے، جون، جولائی میں کسی صحرا کی تپتی دھوپ کی طرح۔ جس کی شدت کا صبح کے پہلے پہر میں انسان کو اتنا پتہ نہیں چلتا، لیکن جیسے جیسے محبت کی دو پہر قریب آتی ہے، بے چینی اور جھٹکے سے انسان کا بُرا حال ہونے لگتا ہے۔ پیاس سے حلق میں کانٹے اُگ آتے ہیں۔ دم لبوں پر آ کر اٹک جاتا ہے، نہ جان جسم کے اندر رہتی، نہ پوری طرح جسم سے باہر نکلتی ہے۔

مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب میں ایمان کی محبت کے پہلے پہر سے نکل کر اس محبت کی دو پہر تک جا پہنچا تھا۔ مجھے تو اس کی محبت کے پہلے پہر کا سکون بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ جب تک میں اس محبت ابتدائی کے جھٹکے سے سنبھلا، تب تک اس کی محبت کی کڑکتی دو پہر میرے سر پر موجود تھی۔

اس دن حویلی کی سٹڈی میں روکے جانے پر اور اس سازش میں اپنی عزیز از جان سہیلی اور اپنی بہن کے شریک ہونے پر وہ اس قدر برہم تھی کہ اُس نے کئی روز تک اپنی بہن حیا اور نگہت سے بات نہیں کی۔ لیکن نگہت بھی اپنی دھن کی چکی تھی۔ وہ باقاعدہ دھرتا دے کر ایمان کے گھر کے کچے صحن میں جا بیٹھی کہ جب تک مجھے معاف نہیں کرو گی، میں یہیں بیٹھی رہوں گی۔ ایمان کی اماں نے پہلے نگہت کو اور پھر ایمان کو ڈھائیاں دیں کہ گھر کے مردوں کی واپسی کا وقت ہے، خدا کے لیے ان دونوں کے درمیان جو بھی جھگڑا ہے ختم کر دیں۔ خاص طور پر انہیں مولوی صاحب کا ڈر تھا۔ اگر وہ گھر آ جاتے اور نگہت کو یوں صحن میں بیٹھا دیکھ لیتے تو جانے کیا سمجھتے۔۔۔۔۔؟ ان کا بچوں پر رعب بھی تو بہت تھا۔ مجبوراً ایمان کو ہی ہتھیار ڈالنے پڑے اور وہ نگہت کو بازو پکڑا اٹھا کر اپنے اور حیا کے کمرے میں لے گئی اور پھر وہاں ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ وہ نگہت کے گلے لگ کر خوب روئی اور اُس نے نگہت سے وعدہ لیا



”واٹ رُبش What Rubbish۔۔۔۔۔ سجاد بھائی نے سرپیٹ لیا۔ ”مجھے پتہ تھا یہ کوئی  
 کمشنر صاحب کو جلال آ گیا۔ وہ منہ سے پاپ کا دھواں اُگلتے ہوئے دھاڑے  
 ”ہماری سات نسلوں کی عزت کو بٹہ لگانے چلا ہے یہ۔“ عبرینہ بھابھی نے بُرا سا منہ بنایا۔

ان کا جملہ پورا ہونے سے پہلے میں ڈائننگ ہال سے باہر نکل چکا تھا۔ لیکن کاش میں



آج بھرے بازار میں میری معصوم بچیوں کے کردار پر کچڑا اچھالا گیا۔ انہیں رسوا کیا گیا، صرف تمھاری وجہ سے، کاش۔۔۔۔۔ کاش میں تمھیں کوئی بد عادے سکتا۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔ بہر حال وہ بڑا انصاف والا ہے۔۔۔۔۔ میرا انصاف بھی وہ خود ہی کرے گا۔۔۔۔۔ مولوی صاحب کی آواز جذبات کی رو میں ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہی تھی۔ انہوں نے اس کے بعد کوئی بات نہیں کی۔ اپنی سائیکل پر سوار ہو کر وہاں سے چل دیے۔ میں سر جھکائے وہیں گیٹ کے پاس کھڑا رہ گیا۔

میرے ذہن میں طوفانوں کی آندھی چل رہی تھی۔ میرے ذہن میں پہلے یہ بات کیوں نہیں آئی کہ میرے گھر والے اس حد تک بھی گر سکتے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ ان کا مجھ پر کوئی زور نہیں چل سکتا۔ اس لیے انہوں نے رات ہی کو اس وجہ کو ہی ختم کرنے کا منصوبہ بنا لیا تھا جس کی وجہ سے میں نے بغاوت کی جرأت کی تھی۔ کاش۔۔۔۔۔ کاش اگر مجھے پہلے ان کے ارادوں کا علم ہو جاتا تو میں مولوی صاحب کو راستے سے ہی واپس بھیج دیتا۔۔۔۔۔ کاش۔۔۔۔۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ امی اور بھابھی نے موقع پا کر اپنا وار کر دیا تھا۔ مولوی صاحب کو گالی دی گئی تھی کہ وہ محفلوں میں اپنی بیٹیوں کو سجا کر اس لیے بھیجتے ہیں کہ مجھ جیسا کوئی رئیس زادہ ان پر فریفتہ ہو جائے۔ اُن کے منہ پر اُس ماہ کی تنخواہ مار کر انہیں آئندہ اس گھر کا رخ نہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ ذرا سوچئے۔۔۔۔۔ اس سلوک اور ان الزامات کے بعد ایک سفید پوش اور ایک پاک باز غیرت مند انسان کے پاس سوائے مرجانے کے اور کیا چارہ رہ گیا ہوگا؟ لیکن داوی صاحب جیسوں کے پاس تو موت جیسی عیاشی سرزد ہونے کا بھی کوئی موقع نہ تھا۔ اگر امارے مذہب میں خودکشی حرام نہ ہوتی تو اس روز مولوی صاحب یقیناً خود کو ختم کر لیتے۔ اور ہر سب کچھ میری وجہ سے ہوا تھا۔ میں ان کی اس بے عزتی کا ذمہ دار تھا۔ مجھے اس لمحے خود سے ہی شدید نفرت کا احساس ہوا۔ میں غصے میں واپس اندر کی طرف پلٹا اور پھر میرے راستے میں ڈرائنگ روم، لاؤنج، لابی کی جو بھی چیز آئی وہ ٹوٹ کر کرچیوں میں تبدیل ہوتی گئی۔ بھابھی تو ڈر کے مارے اپنے کمرے سے ہی باہر نہیں نکلیں۔ البتہ امی کے ساتھ خوب مٹ ہو گئی۔ انہوں نے روایتی عورتوں کی طرح مجھے طعنے دیے۔ مجھ پر مولوی صاحب کے گھر والوں کی طرف سے تعویذ گنڈوں کے زیر اثر ہونے کا الزام بھی لگا۔ پھر آخر میں وہی۔۔۔۔۔

اس دن وہاں کمرے سے باہر نکلنے سے پہلے امی کا پورا جملہ سن لیتا تو اگلے دن وہ غضب نہ ہوتا جو ہوا۔

سوائے عباد کے تمام گھر والوں نے میرا مکمل بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ اگلے دن میں یونہی گم سم اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ اچانک نیچے سے امی اور بھابھی کے زور زور سے چلانے کی آوازیں آنے لگیں جیسے کسی سے لڑ رہی ہوں۔ پہلے تو میں نے اس بات پر کوئی خاص توجہ نہیں دی کیونکہ آج کل گھر میں ایسے ڈرامے تقریباً روز ہی ہوتے تھے۔ لیکن کچھ دیر کے بعد مجھے احساس ہوا کہ یہ معاملہ تو کچھ مجھ سے متعلق ہے۔ میں جلدی سے اپنے کمرے سے باہر نکلا اور ریلنگ کے قریب آ کر دیکھا تو نیچے لاؤنج میں مولوی علیم سر جھکائے کھڑے تھے، ان کے ماتھے پر ندامت کا پسینہ آنکھوں میں آنسو اور سارے بدن میں جیسے لرزش سی تھی، امی اور بھابھی مل کر جانے انہیں کیا کیا مغلصات سنار ہی تھیں۔ میرے قدموں کے نیچے سے تو جیسے زمین ہی نکل گئی۔ میں وہیں اوپر سے کھڑے کھڑے چلایا۔ ”امی۔۔۔۔۔ بس کریں بہت ہو گیا۔“

امی اور بھابھی مجھے دیکھ کر چپ ہو گئیں اور لاؤنج سے ملحقہ ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئیں۔ مولوی صاحب بھی پلٹے اور ٹوٹے ہوئے قدموں سے واپس ہو لیے، جب تک میں جوتے پہن کر بھاگتا ہوا باہر پہنچا وہ اپنی سائیکل نکال کر گیٹ تک پہنچ چکے تھے۔ میں بھاگتا ہوا ان کے سامنے آ گیا اور ان کے راستے میں مزاحم ہو گیا۔ مولوی صاحب کی آنکھوں سے آنسو اب رفتار سے بہہ رہے تھے کہ ان کی سفید داڑھی بھی بھیگ چکی تھی۔ مجھے اور تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا بس میں نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

”ان سب کی طرف سے میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ حالانکہ ان کا گناہ قابل معافی نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی میں آپ سے التجا کرتا ہوں۔“

مولوی صاحب نے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا، ان کی اس ایک نظر میں جو شکوہ تھا اس نے جیسے مجھ پر گھڑوں پانی ڈال دیا، میری نظر خود بخود جھک گئی۔

”میں نے تمھارا کیا بگاڑا تھا حماد میاں۔ غریب آدمی کے پاس صرف ایک ہی بھرم ہوتا ہے۔ اس کی عزت کا بھرم۔۔۔۔۔ تم نے آج مجھ سے وہ بھرم بھی چھنوا دیا۔ کیوں۔۔۔۔۔“



جو ایک ماں کا آخری ہتھیار ہو سکتا ہے۔۔۔ آنسو۔۔۔

رات کو کمشنر صاحب کی عدالت لگی اور میرے خلاف حتمی فیصلہ دے دیا گیا کہ مجھے اس گھر کی روایتوں کو توڑنے کی ہرگز اجازت نہیں دی جائے گی۔ اور اگلے ہفتے مجھے ہر حال میں لندن کی فلائٹ لینے ہی ہوگی۔ میں نے اس رات کمشنر صاحب سے زیادہ بحث نہیں کی۔ میں جانتا تھا اور فیصلہ کر چکا تھا کہ مجھے اب کیا کرنا تھا۔

دوسرے دن صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی میں پرانی حویلی جا پہنچا۔ شا کر کو حویلی کے دوسرے نوکروں سے اس معاملے کی سن گن مل چکی تھی۔ لیکن گھر پہ کل موجود نہ ہونے کی وجہ سے اسے پوری بات کی خبر نہیں تھی۔ اس قدر صبح وہ مجھے پرانی حویلی میں پا کر اور زیادہ پریشان ہو گیا۔ اور بھاگا بھاگا میرے پیچھے حویلی کے پرانے بڑے گول کمرے میں چلا آیا۔

”حماد بابا۔۔۔۔۔ یہ سب کیا ہے۔۔۔۔۔ یہ میں کیا سن رہا ہوں۔۔۔۔۔ کل مولوی صاحب کو نوکری سے فارغ کر دیا گیا۔۔۔۔۔ بلکہ، مجھے تو شرافت چوکیدار نے بتایا ہے کہ۔۔۔۔۔“

”تم نے ٹھیک سنا ہے، اور یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا ہے۔“

میں نے شا کر کو ساری بات الف سے لے کر ی تک سنا دی۔ شا کر سر تھام کر وہیں بیٹھ گیا۔ ”یہ آپ نے کیا کیا بابا۔۔۔۔۔؟ آپ اچھی طرح جانتے تھے کہ آپ کے گھر والے اس رشتے کے لیے کبھی راضی نہیں ہوں گے۔۔۔۔۔ اور مولوی صاحب۔۔۔۔۔ وہ تو بہت نازک انسان ہیں بابا۔۔۔۔۔ اور نگہت۔۔۔۔۔ اس سے تو مجھے اس بے وقوفی کی بالکل بھی توقع نہیں تھی۔“

”اس میں نگہت کا کوئی قصور نہیں ہے، تم جانتے ہو وہ میری بات نہیں ٹال سکتی۔ پلیز تم اسے کچھ مت کہنا۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ لیکن جو زیادتی گھر والوں نے مولوی صاحب کے ساتھ کی ہے اس کا ازالہ کیسے ہوگا۔“

”اس کا ازالہ بھی میں ہی کروں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میرا رشتہ لے کر مولوی صاحب کے گھر جاؤ۔“ شا کر اچھل پڑا۔

”کیا۔۔۔۔۔؟۔۔۔۔۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، حماد بابا۔۔۔۔۔ میں بھلا کیسے۔۔۔۔۔؟“

”اس کے سوا اب اور کوئی چارہ بھی نہیں۔۔۔۔۔ امی اور بابا کبھی اس گھر رشتہ لے کر نہیں جائیں گے اور مولوی صاحب کے اُجلے دامن پر جو داغ میری وجہ سے لگا ہے وہ کبھی مٹ نہیں پائے گا۔ اس لیے میں نے یہ حتمی فیصلہ کر لیا ہے۔ اب تمہیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ تم میرا ساتھ دو گے یا نہیں۔؟“

شا کر خاموش بیٹھا کسی گہری سوچ میں گم تھا۔

نگہت چپ چاپ اندر آئی اور چائے کی ٹرے رکھ کر میرے اور شا کر کے لیے پیالیوں میں چائے ڈال کر واپس چلی گئی۔ شا کر نے سر اٹھایا۔

”بہت بڑے امتحان میں ڈال دیا ہے آپ نے مجھے بابا۔۔۔۔۔“

ایک طرف برسوں کی مولوی صاحب سے دوستی ہے تو دوسری طرف آپ کا برسوں کا ہمک ہے۔ میں جانتا ہوں کہ شاید میں اس طرح مولوی صاحب کی برسوں کی دوستی کو کھونے پاؤں۔ لیکن کیا کروں۔۔۔۔۔ میں آپ کو بھی تو نہیں کھو سکتا۔“

شا کر ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ لیکن جانے کیوں اس کی یہ خاموشی مجھے کسی گہرے طوفان کا پیش خیمہ لگ رہی تھی۔



## یادیں

”یادیں بھی ہمارے ساتھ کبھی کبھی کیسے کھیل کھلتی ہیں۔ یہ ہمیں وہ سب سوچ کر ہنسنے پر مجبور کر دیتی ہیں جب ہم کسی کے ساتھ مل کر روئے تھے۔۔۔۔ اور کبھی ہمیں یہ سوچ کر رونے پر مجبور کر دیتی ہیں کہ کبھی ہم کسی کے ساتھ مل کر بنے تھے۔“

اس دن عبرانی زبان والی نوک جھونک کے بعد سارہ کافی محتاط ہو گئی تھی۔ وہ اب بھی مجھ پر طنز کے وار تو کرتی تھی۔ لیکن اب اس کے انداز میں احتیاط کا پہلو نمایاں تھا۔ جوزف ت اب بھی ہمارے اسی پسندیدہ اور مخصوص بیچ پر تقریباً روزانہ ہی ملاقات ہوتی تھی۔ اُس نے مجھے اپنی بہت سی اندرونی باتیں بھی بتادی تھیں۔ مثلاً یہ کہ اُس کے خاندان میں اب صرف وہ اور اس کی بیوی ہی ایک چھت تلے رہتے ہیں۔ تینوں بچے جوان ہونے کے ساتھ ہی ایک ایک کر کے گھر چھوڑتے گئے۔ اس عمر میں وہ یہ نوکری بھی اس لیے کر رہا ہے کیونکر گزر بسر کے لیے اس کے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں اور وہ اولڈ ہوم جانا نہیں چاہتا۔ وہ ایک دن مجھے یونیورسٹی سے واپسی پر برج ٹاؤن میں واقع اپنے چھوٹے سے گھر بھی لے کر گیا تھا۔ اس کی بیوی میری ایک مہربان عورت تھی جس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی گہری اُداسی تھی۔ وہ مجھ سے اسی طرح پیش آئی جیسے ایک ماں اپنے کسی بچھڑے بیٹے سے پیش آ سکتی ہے۔ اُس نے دیر تک مجھے واپس نہیں جانے دیا اور اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی بہت سی چیزیں بھی کھلائیں اور ہمارے گاؤں کی بڑی بوڑھیوں کی طرح جاتے ہوئے میری جیبوں میں بھی بھر دیں۔ جیسے بچپن میں میری مانی اور میری دادی ان کے گھر سے واپسی پر میری جیبیں اخروٹ، کشمش، پتے اور خوبانیوں سے بھر دیتی تھیں۔۔۔۔ شاید دنیا کے ہر خطے کی محبت کی ایک ہی بولی ہوتی ہے، شیرے جیسی میٹھی اور کچے دھویں جیسی آنکھیں جلانے والی بولی۔۔۔۔

لندن کے موسم کا بھی بے وفا محبوب کی طرح کوئی اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ ابھی پل میں

ہ چمک رہی ہوتی ہے کہ دوسرے ہی پل ریم جھم کی جھڑی آپ کا تن من بھگو نے لگتی ہے۔ دن بھی جب صبح میں نے یونیورسٹی کے لیے نکلنے سے پہلے کھڑکی سے باہر جھانکا تو ہ چمک رہی تھی۔ لیکن جب میں گھر سے نکل کر سڑک کے کٹڑ پر لگی کافی کی مشین تک پہنچا تب آسمان بادلوں سے ڈھک چکا تھا اور میرے یونیورسٹی پہنچتے پہنچتے پھوار پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ میں یونہی بھینکتا ہوا، کاندھے پر اپنے نوٹس کا بیگ لٹکائے کلاس روم میں داخل ہوا۔ لگن یہ کیا۔ آج تو کلاس بالکل خالی پڑی تھی۔ کیا میں جلدی آ گیا تھا یا پھر لیکچر ہی کسی اور کمرے میں ہونا تھا۔ میں یہی سوچتا ہوا کلاس سے نکلنے کے لیے پلٹا۔ اس لمحے میری نظر لیکچر روم کے بلیک بورڈ پر پڑی۔ اور وہاں لکھی تحریروں نے میرے قدم جکڑ لیے۔ بلیک بورڈ پر لکھائوں کے لیے تضحیک آمیز جملے لکھے ہوئے تھے۔ اور ہر جملے کے بعد یہودیوں کا مخصوص نشان (Davidstar) یعنی چھ کونوں والا ستارہ بنا ہوا تھا۔ ہر جملے سے زہر ٹپک رہا تھا، ان دنوں مسلمانوں (Down with Muslims)، ٹیررٹسٹس (Terrorists)۔ ☆ دی ای اوٹلی گریٹ ☆ مسلمانوں یہ کیسپس چھوڑ دو، اور اس طرح کے دوسرے بہت سے۔۔۔۔۔

میں جانتا تھا کہ اس کلاس میں صرف میں ہی ایک اکیلا مسلمان تھا اور یہ سب کچھ میرے لیے ہی لکھا گیا تھا۔ اور کس نے لکھا تھا۔ یہ بھی میں بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ میرے دل میں ایک عجیب سی گرم لہر دوڑ گئی۔ مجھے پہلی مرتبہ کامران کی کہی ہوئی باتوں میں صداقت مل رہی تھی۔ اتنے میں کلاس میں رہا داخل ہوئی رہا آسٹریلیا میں تھی اور میرے ہی سیشن ماہری ہم جماعت بھی تھی۔ اُس نے بلیک بورڈ پر لکھی تحریروں دیکھ کر حیرت سے میری طرف دیکھا۔

”ہے میڈی۔۔۔۔۔ یہ سب بکواس کس نے لکھی ہے یہاں پر۔“

کلاس کی سب سے مغرور اور بد دماغ لڑکی نے۔۔۔۔۔ اور بھلا کوئی ایسا کیوں کرے

”یو مین سارہ۔۔۔۔۔؟ نو مین۔۔۔۔۔ وہ ایسا نہیں کر سکتی۔“

”اگر تمہیں کہیں وہ مل جائے تو اُس سے کہنا کہ میں نہیں جانتا تھا کہ خود کو عظیم کہنے اور



میں نے جوزف کو کلاس روم میں پیش آنے والا سارا واقعہ سنا دیا۔ جوزف کو بھی غصہ نہیں ہوگی۔“

”تنگ نظری کی بھی انتہا ہوتی ہے۔ لیکن جانے کیوں، میں بھی ربیکا کی اس بات سے ماؤں کہ سارہ ایسا نہیں کر سکتی۔ شاید میں نے تمہیں پہلے بتایا نہیں۔ وہ یہاں داخلے سے لگی ایک اور ادارے میں مجھ سے شام کی پیٹنگ کلاسز لیتی رہی ہے۔ اور وہ خود بھی ایک اٹھی مصورہ ہے۔ تم لوگوں کے خلاف اس کے دل میں واقعی بہت بغض بھرا ہوا ہے اور وہ اس میں کسی انتہا تک جاسکتی ہے۔ لیکن اُسے سامنے سے وار کرنے کی عادت ہے۔ وہ ٹمپ کر کوئی ایسا بیچ اقدام نہیں کر سکتی۔ دراصل وہ اسے بھی یہودیت کی توہین سمجھتی ہے۔“

میں نے بے زاری سے سر ہلایا۔

”کیا کہہ سکتا ہوں۔۔۔۔۔ بہر حال۔۔۔۔۔ اب مجھے ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ میرا لوگوں سے ٹکراؤ ناگزیر ہوتا جا رہا ہے۔ شاید پروپیگنڈا ہی ان یہودیوں کا سب سے بڑا ہار ہوتا ہے۔“

”ٹھیک سمجھے ہو تم، اسی لیے یہ لوگ ساری دنیا میں کاروبار پر چھائے ہوئے ہیں۔ یہ کاروبار کو اپنے پروپیگنڈے کے لیے اور پروپیگنڈہ کو اپنے کاروبار کی وسعت کے لیے کامیابی سے استعمال کرتے ہیں کہ جس کا کوئی جواب نہیں۔ اور اس بزنس سے یہ اتنا منہ ہیں کہ ان کی دولت دنیا کی چند سب سے بڑی مملکتوں کی بادشاہت بدلنے کا باعث بنتی ہے۔ شاید تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ دنیا میں فریچائز سسٹم کے بانی بھی یہودی اور اسی سسٹم کی بدولت آج یہ دنیا کے ہر گلی کوچے میں اپنا کاروبار پھیلا چکے ہیں۔“

میں نے غور سے جوزف کی طرف دیکھا۔

”اگر یہ اتنے ہی کامیاب ہیں تو پھر اس قدر خوف زدہ کیوں ہیں۔“

”جوزف مسکرایا۔“ شاید یہ ایک خوف ہی ان کی قسمت میں ازل سے لکھ دیا گیا ہے۔ یہ دنیا میں سب سے زیادہ نبی اسی قوم پر اترے ہیں۔ یعقوب سے لے کر موسیٰ تک ہر نبی اس قوم پر مبعوث ہو چکے تھے۔ اگر اس تعداد کو تم ان کی فی نسل پر تقسیم کرو تو ان کی

سمجھنے والے اس قدر کمزور ہوں گے کہ ان میں اپنے مخالف کے منہ پر بات کہنے کی جرأت نہیں ہوگی۔“

میں ربیکا کو یہ پیغام دے کر وہاں سے نکل آیا۔ اب میرا کلاس لینے کا بھی با نہیں ہو رہا تھا۔ باہر اب بھی دیے ہی ہلکی سی ہنھوار کا سلسلہ جاری تھا۔ جن دنوں بارش یا باری ہوتی تھی، ان دنوں گھاس کے میدانوں میں اور یونیورسٹی کے درمیان سے گزرتی کے کنارے پڑے پتھروں اور کرسیوں پر لگی بڑی بڑی نیلی پیلی چھتریاں کھول دی جاتی تھیں باہر نکلتے ہی جوزف بھی مجھے ایک ایسی ہی نیلی چھتری کے نیچے نہر کنارے اپنے پسندیدہ پر بیٹھا نظر آیا۔ آج وہ بارش کی تصویر کشی کرنے کے لیے اپنے ساتھ کینوس شینڈ وغیرہ لے کر آیا تھا اور نہر میں گرتی بوندوں سے پیدا ہونے والے پانی کے ارتعاش اور اس ارتعاش سے بگڑتے، سکڑتے پانی کے عکس پر بنی شبیہوں کی تصویر کشی کر رہا تھا۔

میں اُس کی طرف بڑھ گیا اور بیٹھ کر اس کی تصویر بننے دیکھتا رہا۔ واقعی جوزف اچھا مصوٰر تھا۔ اُس نے نہر میں یونیورسٹی کی عمارت کے عکس کی تصویر بنائی تھی، لیکن یہ سا عکس کی تصویر نہیں تھی بلکہ نہر کے پانی میں گرتی بارش کی بوندوں سے ہوئی ہلچل کے اس عکس میں ہوتی تبدیلیوں کی تصویر تھی۔ جوزف نے بہت چھوٹی چھوٹی سی جزئیات پورا ادھیان رکھا تھا۔ جوزف تصویر بناتے بناتے میری طرف پلٹا۔

”کہو، کیسی لگی۔۔۔۔۔؟“

”بہت خوب، لگتا ہے کہ کینوس خود ایک نہر ہے۔ جس پر تم بارش کے چھینڈ صورت میں رنگ پھینک رہے ہو۔“

جوزف نے خوشی سے ہاتھ پر ہاتھ مار کر تالی بجائی۔

”واہ۔۔۔۔۔ میری تصویر کی آج تک کسی نے اتنی مکمل تعریف نہیں کی۔ واقعی تمہا لفظوں کا جواب نہیں ہوتا۔ میں رنگوں سے تصویر بناتا ہوں اور تم لفظوں سے تصویر کشی ہو۔“

جوزف اپنی تصویر کو اختتامی سٹروک دے کر میرے ساتھ بیچ پر آ بیٹھا۔

”کیا بات ہے۔ آج تم کچھ اُلجھے ہوئے سے نظر آ رہے ہو۔“



ہر نسل پر توے نبی اترے ہیں لیکن پھر بھی یہ قوم گمراہ ہی رہی۔ یہ خوف اسی گمراہی کا خو ہے۔“

میں حیرت سے جوزف کی باتیں سن رہا تھا۔ مجھے نہیں پتہ تھا کہ وہ یہودیوں کی تاریخ کے بارے میں اتنی تفصیل سے جانتا ہوگا۔ جوزف نے گہری سانس لی۔

”بہر حال میں تم سے پھر یہی کہوں گا کہ ان لوگوں سے نہ الجھنا ہی بہتر ہے۔ کیونکہ ہر اور پتھر کی لڑائی میں زخمی ہمیشہ سر ہی ہوتا ہے۔ ان لوگوں کو اپنی عظمت اور برتری کا جنون ہے جسے ان کے دماغوں سے نکالنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔“

ہمارے سامنے نہر میں بننے والوں میں ایک دم تیزی سی آگئی۔ بارش تیز ہو گئی تھی مرغابیوں کی ایک ڈار نے تیز بارش سے گھبرا کر لمبی سی اڈاں بھری۔ ساکت فضا میں پروں کے پھڑ پھڑانے کا شور گونجا۔ جوزف نے اپنی تصویر اور دیگر سامان جمع کرنا شروع کر دیا۔ میں بھی اس کی مدد کرتا رہا۔ لیکن میرا ذہن اب بھی جوزف کی باتوں میں الجھا ہوا تھا۔ شاید جوزف بھی میری بے خیالی بھانپ گیا۔

”کیا سوچ رہے ہو۔“

”سوچ رہا ہوں کہ کہیں نہ کہیں یہ لوگ بھی جانتے ہیں کہ اصل میں وہ خود عظیم نہیں ہیں عظیم کوئی اور لوگ ہیں۔ اور اصل میں ان کا یہ خوف اسی وجہ سے ہے کہ کہیں وہ دوسری نسل اپنی عظمت کو دوبارہ پہچان نہ لے۔ اسی لیے وہ ان کو اور کسی دوسری نسل کو بھی سنبھلنے نہیں دے رہے۔ کہتے ہیں کہ جھوٹ کو اگر روزانہ ایک ہی تسلسل اور روانی سے بولا جائے تو ایک وقت آتا ہے کہ جھوٹ جھوٹ نہیں رہتا۔ سچ بن جاتا ہے اور لوگ سچ کو جھوٹ سمجھنے لگتے ہیں۔ شاید یہ یہودی بھی اسی کلیے پر عمل کر رہے ہیں۔ یہ جانتے ہیں کہ ان کا جھوٹ دنیا پر سچ بن کر ظاہر ہو رہا ہے۔ اور ہمارا سچ بھی اب لوگوں کو جھوٹ لگتا ہے۔ یہ دنیا زور آوروں کی ہے۔ زور آ جاوے گا، وہی سچ ہوگا۔ اور اس وقت یہودی ہی وہ زور آور ہیں۔“ جوزف بھی میری بات سن کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

## محبتِ ناتمام

شا کر سے اپنا رشتہ ایمان کے گھر لے جانے کی بات کرنے کے بعد اس دن شام کو میں واپس گھر پہنچا تو کمشنر صاحب کا پارہ آسمان کو چھو رہا تھا۔ میں لاؤنج کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر ماہی رہا تھا کہ ان کی گرجتی آواز نے میرے پاؤں جکڑ لیے۔

”ٹھہرو۔“

میں رک گیا۔ امی اور سجاد بھائی بھی عبرینہ بھابھی سمیت اپنے کمرے سے نکل آئے۔ بابا آج ایک مکمل کمشنر صاحب کے روپ میں موجود تھے اور میں ان کے سامنے کسی بہتہ ”ب“ کے مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔

”تو تم لندن نہیں جاؤ گے۔“

”میں لندن جانے کے لیے تیار ہوں، اگر آپ لوگ اس گھر میں مولوی علیم کے ساتھ کی گئی بدتمیزی کا ازالہ کر دیں۔“

کمشنر صاحب دھاڑے۔

”واٹ۔۔۔۔؟۔۔۔۔۔ تو کیا اب تم چاہتے ہو کہ ریٹائرڈ کمشنر امجد رضا جس کے نام کی گونج ایوان صدر تک ہے وہ اب ایک معمولی مولوی کے سامنے معذرتیں پیش کرنا پھرے گا۔ جسٹ فارگٹ ایٹ Just forget It۔“

”تو پھر آپ سب بھی یہ بھول جائیں کہ میں آپ لوگوں کی کسی ہدایت پر عمل کروں گا۔“

میں نے سیڑھیاں چڑھنے کے لیے قدم اٹھایا۔

کمشنر صاحب پھر دھاڑے۔

”تم شاید یہ بھول رہے ہو کہ تم جس چھت تلے رہتے ہو وہاں صرف میری ہدایات اور



”بچے کو پیدل چلنا اس کے ماں باپ سکھاتے ہیں۔ افسوس آپ دونوں نے مجھے واقعی پیدل چلنا نہیں سکھایا۔ لیکن وقت سب کچھ سکھا دیتا ہے۔ وہ بھی جو انسان کے ماں باپ اسے سکھانا بھول جاتے ہیں۔ میں بھی نوکروں، ایئر کنڈیشنڈ کمروں اور منرل واٹر کے بنا جینا سیکھ ہی جاؤں گا۔ اور اگر نہ بھی سیکھ پایا تو آپ اطمینان رکھیے۔ آپ سے مدد مانگنے پھر بھی نہیں آؤں گا۔“

امی چلاتیں رہ گئیں، سجاد بھائی ٹیٹا کے رہ گئے۔ بابا تلملا کر اپنے پائپ کا دھواں اُگلنے رہے اور میں اس گھر سے نکل آیا۔

میرے سامنے شہر کے کھلے راستے تھے اور سر پر دھوپ اگلتا آسمان، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرف کی راہ لوں۔ بابا نے سچ کہا تھا، میں کبھی پیدل گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ میں نے اس شہر کا ہر راستہ اپنے نئے ماڈل کی گاڑی کی دنڈ سکرین سے ہی دیکھا تھا۔ آج زمین پر ان راستوں پر چلتے ہوئے ان کی طوالت اور اصل منظر کا احساس ہو رہا تھا۔

کہتے ہیں ہر انسان دنیا کو بدلنے کی باتیں تو کرتا ہے۔ لیکن خود کو بدلنے کی کبھی کوشش نہیں کرتا۔ آج سے میں نے خود کو بدلنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ بہت دیر تک میں ایک پارک کے بیچ پر بیٹھا ان بدلے ہوئے حالات پر غور کرتا رہا۔ میری جیب میں دو چار سو روپے ہی موجود تھے۔ اپنا اے۔ ٹی۔ ایم کارڈ اور کریڈٹ کارڈ میں وہیں لاؤنج میں گھر سے نکلنے سے پہلے گھروالوں کے سامنے پھینک آیا تھا۔ جانے یہ پیسے کیسے رہ گئے تھے جیب میں۔ شام دھیرے دھیرے پارک میں اترتی جا رہی تھی۔ لوگ جو آس پاس چہل قدمی یا ستارے تھے دھیرے دھیرے اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہونا شروع ہو چکے تھے اور کچھ ہی دیر میں وہ پارک خالی ہو گیا۔ مغرب کا وقت ہو چکا تھا۔ پارک کے چوکیدار نے مجھے آکر پارک بند کرنے کی اطلاع دی۔ ظاہر ہے اس کے کہنے کا مقصد یہی تھا کہ صاحب پارک بند ہو چکا ہے۔ اب آپ بھی اپنے گھر جائیے۔۔۔۔۔ لیکن میرا تو آج کوئی گھر ہی نہیں تھا۔ میں کس کے گھر جاؤں۔۔۔۔۔؟ بچپن سے لے کر آج تک میں جسے اپنا گھر سمجھتا رہا وہ تو کمشنر صاحب کی عدالت نکلا۔ بات مانو تو رہو۔۔۔۔۔ نہ مانو تو نکل جاؤ۔ ایسے ماں باپ ہم بچوں سے سالانہ ایک کنٹریکٹ فارم کیوں نہیں بھر دیا کرتے۔۔۔۔۔؟ جس میں تمام شرائط درج

میرا حکم ہی چلتا ہے۔“  
گو یا مجھے بالواسطہ یہ دھمکی دی جا رہی تھی کہ اگر میں نے کمشنر صاحب کے احکامات کی تعمیل نہیں کی تو مجھے گھر بدر بھی کیا جاسکتا ہے۔ مجھے کوئی خاص حیرت نہیں ہوئی۔ کمشنر صاحب اپنی کمشنری کے دور میں بھی تو یونہی مجرموں کو شہر بدر اور قصبہ بدر کرتے رہے ہوں گے۔ اور پھر میرا تو جرم بھی بہت بڑا تھا ”جرمِ عشق“۔۔۔۔۔ اور اس جرم کی معافی تو کسی بھی دور میں روا نہیں رکھی گئی۔ آج میں بھی اپنے گھروالوں کی اس خود ساختہ عدالت میں محبت کا مجرم بنا کھڑا تھا۔

میں کمشنر صاحب کی طرف پلٹا۔

”تو کیا نہیں یہ سمجھوں کہ مجھے اس گھر میں مزید رہنے کا کوئی حق نہیں۔“

امی گھبرا گئیں۔ شاید انہیں بات کچھ بگڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔

”نہیں بیٹا۔۔۔۔۔ ہم بھلا ایسا کیوں چاہیں گے۔۔۔۔۔ ہم تو بس یہ چاہتے ہیں کہ تم

اپنے ذہن اور دل سے اُس لڑکی کا خیال نکال دو۔“

”میں اُسے اپنے ذہن اور دل سے نکالنے سے زیادہ آسان اس گھر سے نکلنے کو سمجھتا

ہوں۔۔۔۔۔“

میں نے واپس جانے کے لیے قدم باہر کی طرف بڑھائے۔ امی چلائیں۔

”حماد۔۔۔۔۔ یہ کیا حماقت ہے؟“

کمشنر صاحب گرجے، ان کے لہجے میں طنز اور حقارت کا ایک طوفان چھپا تھا۔

”جانے دو! سے۔۔۔۔۔ دو دن میں آٹے وال کا بھاد معلوم ہو جائے گا۔ اسے باہر دھوپ ابھی تک لگی نہیں ہے۔ نوکروں کی فوج کی خدمتوں تلے ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں زندگی گزارنے والے اور منرل واٹر پینے والے اس شہزادے نے ابھی تک گھر سے باہر کی سختیوں کی اک جھلک بھی نہیں دیکھی۔۔۔۔۔ ایک رات باہر رہے گا تو عشق کا سارا بھوت سر سے اُجائے گا۔ اسے تو ٹھیک سے پیدل چلنا بھی نہیں آتا، کہو میاں جہاں جانا چاہتے ہو وہاں تا چلے جاؤ گے یا ڈرائیور سے کہوں کہ تمہیں وہاں تک چھوڑ آئے۔“

میں کمشنر صاحب کی طرف پلٹا۔



لیکن آج جیسے ہی تنہا ہو کر میں نے بھیگی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا تو میرے یہ سبھی بُدانے دوست بنا کسی شکوے اور شکایت کے پھر سے ماضی کی طرح میرے سر پر آن جمع ہوئے تھے، میرا درد بانٹنے کے لیے۔۔۔۔۔۔ بچپن میں ہر بچہ اپنی پسند کا ایک تارہ منتخب کر لیتا ہے۔ وہ کامران والا تارہ تھا، یہ نگلی کا تارہ، یہ دو عباد نے اپنے لیے رکھ چھوڑے تھے۔ اور یہ رہا میرا تارہ۔ سب سے چمک دار مجھے بچپن سے ہی سب سے الگ اور سب سے نمایاں چیزیں چننے کی عادت تھی۔ وہ بھی تو ایسی ہی تھی۔ سب میں نمایاں، سب سے الگ، اگر میرے دل نے اس کی خواہش کی تھی تو اس میں ایسا کیا بُرا تھا۔ یہ سارا زمانہ میرا دشمن کیوں ہو گیا تھا۔۔۔۔۔؟ یہ زمانہ ہمیشہ ہی سے محبت کرنے والوں کے خلاف کیوں ہو جاتا ہے؟ ایسے ہی کچھ بے نام سے سوالوں کی یلغار میں ساری رات بیت گئی۔ میں تب چونکا جب میرے دوست ستاروں نے ایک ایک کر کے مجھ سے وداع لینا شروع کر دی اور صنوبر چیز اور چیری کے درختوں پر پرندوں کے گھونسلوں سے ان کے ننھے ننھے بچوں کی چیخ و پکار بلند ہونا شروع ہو گئی۔ شاید پرندوں کے گھونسلے بھی ہمارے گھروں کی طرح ہی ہوتے ہیں۔ پہلے بڑے جاگ کر بچوں کے لیے ناشتے پانی کا بندوبست کرتے ہیں پھر چھوٹوں کا جگایا جاتا ہے۔

ہسپتال کی چھوٹی سی مسجد سے اذان کی آواز اُبھری اور پھر نمازی ایک ایک کر کے مسجد کی طرف چل پڑے۔ میں کچھ دیر حیرت سے ان نمازیوں کو دیکھتا رہا جو یوں صبح سویرے، منہ اندھیرے اپنی نیند ترک کر کے، آنکھیں ملے ایک جذبے کے ساتھ مسجد کی طرف روانہ تھے۔ میں آج تک کبھی یوں صبح سویرے اٹھ کر نماز پڑھنے کسی مسجد میں نہیں گیا تھا۔ جانے یہ کیسے لوگ تھے اور وہ کون سا جذبہ تھا جو انہیں یوں مسجد کی جانب کھینچے لے جا رہا تھا؟

میری ساری رات آنکھوں آنکھوں میں ہی کٹ گئی تھی اور اس وقت سورج کی کرنیں اُچھے، لمبے پیڑوں کی شاخوں سے چھن چھن کر زمین تک پہنچ چکی تھیں۔ زندگی کا کاروبار اُل دو اُل ہو چکا تھا۔ شاید کسی بڑے ڈاکٹر کے دورے کا وقت تھا۔ ہسپتال کے سفید وردی اُن ملبوس عملے نے جلدی جلدی ہم سب بیچ کے مکینوں کو دہاں سے ہٹانا شروع کر دیا۔ میرا اہل ویسے بھی یہاں بیٹھے رہنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ مجھے شاکر کے گھر جانا تھا۔ شاید وہ کل ادوی صاحب کی طرف گیا ہو؟ شاید اس کے پاس کوئی نئی خبر ہو؟ میں نے جیب میں غیر

ہوں اور ہر سال بچوں کو پڑھ کر سنائی جائیں۔ تاکہ ہم کبھی اس چار دیواری کو کبھی اپنا ذاتی کہ سمجھنے کی غلطی نہ کریں۔

رات کا اندھیرا اب سڑکوں پر اُتر آیا تھا اور سڑک کے کنارے کھڑے ٹھیلوں پر لائے گیس کے بھاری روشن دان اب جلنے لگ پڑنے تھے۔ چلتے چلتے میری نظر گورنمنٹ سول ہسپتال کے گیٹ پر پڑی۔ مجھے یاد آیا کہ بچپن میں جب میرے تایا یہاں سول سرجن، کرتے تھے تب میں اور کامران اسکول سے واپسی پر یہاں سے ضرور گزرتے تھے۔ ہا اسکول اسی ہسپتال سے آگے جاتی سیدھی سڑک پر واقع چوک کے بعد آتا تھا۔ ہم دونوں نا کے دفتر بھی جاتے اور گھنٹوں اس ہسپتال کی لمبی راہداریوں میں دھما چوڑی مچاتے رہتے ہسپتال کی صنوبر بھرے درختوں سے ڈھکی سڑکوں پر کھیلتے رہتے تھے، مجھے یہ بھی یاد آیا ہسپتال کے لمبے لمبے ایور گرین کے درختوں تلے لکڑی کے لمبے لمبے بیچ پڑے ہوئے تھے۔ جن پر مریضوں کے وہ لواحقین پڑے آرام کرتے رہتے تھے جو دور دراز کے علاقوں سے آئے ہوئے ہوتے تھے اور شہر میں کوئی ہوٹل یا کسی کمرے کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ میری آج کی رات بھی ایک ایسے ہی لکڑی کے بیچ پر گزرنے والی تھی۔ اس وقت مجھے ان چند روپوں کا دھیان بھی نہیں رہا تھا جو اس وقت میری شرٹ کے جیب میں پڑے ہوئے تھے۔

میں ایک خالی بیچ دیکھ کر اسی پر جا کر لیٹ گیا۔ بہت دنوں کے بعد سر پر کھلے آسمان اور تاروں کو یوں اپنے آپ سے باتیں کرتا محسوس کیا تھا۔ بچپن میں جب ہم نانی کے گرمیوں کی رات کو ان کے کھلے صحن میں چار پائیاں ڈال کر سویا کرتے تھے تو تب بھی کہانی سناتی نانی جان کی آواز صرف ہم تک نہیں بلکہ ہمیں دیکھ کر ان مسکاتے تاروں تک بھی جاتی تھی۔ تبھی تو ہمارے صحن میں چار پائیاں ڈال کر ان پر پڑتے ہی یہ ہمارے تارے بھی ہماری چار پائیوں کے اوپر نانی کے گرد و سٹ آتے اور پھر جب تک ہم کہانی سن کر سو نہیں جاتے۔ یہ تارے بھی ہمارے ساتھ جاگتے رہتے، ہنستے کھیلتے اور باتیں کرتے رہتے۔

بچپن کی طرح آج بھی یہ سارے تارے میری آج رات کی تنہائی کے ساتھی تھے میں ان تاروں سے کچھ شرمندگی سی محسوس کر رہا تھا۔ میں نے انہیں اتنا عرصہ بھلائے رکھا تھا



کے جواب میں میں نے صرف ایک سوال کیا۔

”تم مولوی صاحب کے گھر گئے تھے۔۔۔۔۔؟ وہاں کی کیا خبر ہے۔“ شاکر میرا سوال سن کر خاموش سا ہو گیا۔

”ہاں گیا تھا، مولوی صاحب تو اسی دن سے بستر پر پڑے ہیں جس دن سے وہ آپ کے گھر سے واپس آئے تھے۔ پورے گھر پر سوگ جیسی کیفیت طاری ہے۔ ایسے میں مجھے ان سے کوئی دوسری بات کرنا اچھا نہیں لگا۔ بس ان کی عیادت کر کے واپس چلا آیا۔ انہیں اس مددے نے بالکل نڈھال کر دیا ہے۔ شریف آدمی کی زندگی بھر کا اثاثہ صرف اس کی غیرت ادا ہے بابا۔۔۔۔۔ اگر کوئی اس پر ہی دار کر دے تو پھر وہ صرف ایک چلتی پھرتی لاش بن کر رہ جاتا ہے۔“

میں جانتا تھا کہ مولوی صاحب کے گھر پر اس وقت کیا قیامت گزر رہی ہوگی۔ شاکر نے اچھا ہی کیا کہ وہ بنا کچھ بات کیے وہاں سے واپس چلا آیا۔ اب میرے وہاں مزید بیٹھے رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اس لیے میں بھی جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ شاکر نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

”کدھر کا ارادہ ہے حماد بابا۔۔۔۔۔ میں اب آپ کو کہیں نہیں جانے دوں گا۔“

”میری اب کوئی منزل نہیں ہے۔ جس طرف قدم اٹھیں گے چلا جاؤں گا۔ مجھے اپنے آپ کو پہچاننے کا ایک موقع ملا ہے۔ مجھے روک کر اسے ضائع نہ کرو۔ ورنہ میں ساری زندگی اٹا تو کیا خود اپنے سامنے بھی نظریں نہیں اٹھا سکوں گا۔“

شاکر میری طبیعت سے اچھی طرح واقف تھا کہ میں جو بات ایک مرتبہ دل میں ٹھان لوں۔۔۔۔۔ پھر اس سے پلٹنا میرے لیے ناممکن ہو جاتا تھا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ ہانتا تھا کہ میری ساری زندگی پھولوں کی سیج پر گزری ہے۔ یہ کانٹے مجھے بہت جلد لہو لہان کر دیں گے۔ لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ میں نہیں رکوں گا اور یہ در بدری ہی اب میرا مقدر ہے۔ اٹا کر میرے ساتھ حویلی کی آخری حد تک آیا گھر سے نکلتے ہوئے نگہت پر میری نظر پڑی جو اپنے دوپٹے سے اپنے آنسو صاف کرتی دروازے سے لگی کھڑکی تھی۔ میں نے کچھ آگے جا کر زبردستی شاکر کو گھر واپس بھیج دیا۔ اسے اپنی ڈیوٹی پر بھی پہنچنا تھا۔ کمشنر صاحب کا پارہ

ارادی طور پر ہاتھ ڈالے تو نوٹوں کی کڑکڑاہٹ محسوس ہوئی۔ ہاتھ نکال کر دیکھا تو سو سو کے وہی چند نوٹ جو گھر سے چلتے وقت میری جیب میں رہ گئے تھے باہر نکل آئے۔ میں نے ہسپتال کے گیٹ کے قریب کھڑے تانگے والے کو اشارہ کیا اور تانگے میں بیٹھ کر سڑانی حویلی کی طرف چلنے کا کہا۔ اس دن مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے انسان، آس پاس کے تمام منظریوں دکھائی دیتے ہیں جیسے کوئی فلم الٹی چل رہی ہو۔

شاکر جو اس وقت حویلی کے گیٹ سے نکل ہی رہا تھا، مجھے دیکھتے ہی جیسے اپنے حواس کھو بیٹھا، اور میری طرف دوڑا چلا آیا۔ کچھ دیر تک تو وہ مجھے یوں ٹٹول ٹٹول کر دیکھتا رہا جیسے میں کسی اور جہاں کی مخلوق ہوں۔

”حماد بابا۔۔۔۔۔ آپ کدھر چلے گئے تھے۔ رات کہاں گزاری ہے آپ نے، یہ کیا حالت بنالی ہے اپنی۔“

شاکر مجھے لے کر اپنے ہی کوارٹر میں چلا آیا، کیونکہ میں نے حویلی کے ڈرائنگ روم کی طرف جانے سے انکار کر دیا تھا۔ شاکر نے جلدی سے اپنے کوارٹر کی بیٹھک کا دروازہ کھولا، باہر حویلی کے پچھواڑے والے باغ میں کھلتا تھا۔ میں آنکھیں موندھے وہیں صوفے پر بیٹھا رہا جب تک شاکر اندر سے جلدی سے ناشتے کی ٹرے لے کر آ گیا۔ نگہت نے جلدی جلدی چند پراٹھے، تلے ہوئے اور ابلے ہوئے انڈوں کا خاگینہ اور چائے بنادی تھی لیکن میرا دل اس وقت کسی چیز کو ہاتھ لگانے کو بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ شاکر نے بے حد اصرار کر کے چند گھونٹ چائے کے میرے حلق سے نیچے اتروائے۔ مجھے شاکر سے مولوی صاحب کے گھر کے حالات جاننے کی جلدی تھی۔ لیکن شاکر نے پہلے میرے گھر کا احوال دیا۔ اس نے بتایا کہ اس وقت مولوی صاحب کی طرف گیا ہوا تھا جب میں نے گھر چھوڑا تھا۔ شاکر جب ہمارے گھر پہنچا تو نوکروں نے گھر میں ہونے والے ہنگامے کا اس سے ذکر کیا۔ شاکر کے مطابق امی کچھ پریشان تھیں جب کہ بابا اور سجاد بھائی کو یہ اطمینان تھا کہ میں در بدر کی ٹھوکرین کھا کر رات بھر میں ہی واپس آ جاؤں گا۔ البتہ چھوٹا عباد رات بھر مجھے میرے دوستوں کے گھروں میں تلاش کرتا رہا تھا۔

میں نے شاکر کو یہ نہیں بتایا کہ میں نے رات کہاں گزاری تھی۔ اس کے تمام سوالوں



لہم تھے۔ سفید بالوں کو ایک طرف سے مانگ نکال کر سلیقے سے جمار کھا تھا۔ آنکھوں پر نظر  
اٹھتا اور کان پر ایک بال پوائنٹ۔ انہوں نے فائلوں پر نظریں دوڑاتے ہوئے مجھے دیکھا  
پھر سے فائل کا ورق پلٹے ہوئے بولے۔

”ہاں تو حماد میاں۔۔۔۔۔ تم کامران کے دوست ہو۔۔۔۔۔ بتاؤ میں کیا کر سکتا ہوں  
تمہارے لیے۔“

”جی سر۔۔۔۔۔ میں بے روزگار ہوں۔۔۔۔۔ اگر کچھ کام مل جاتا تو۔۔۔۔۔ چاہے  
مارشی ہی سہی۔۔۔۔۔“

صدیقی صاحب نے چونک کر سر اٹھایا اور اس مرتبہ غور سے مجھے دیکھا۔  
”اوہ۔۔۔۔۔ تو یہ بات ہے۔۔۔۔۔ میں تو سمجھا تھا کہ کوئی سیٹ ریزرویشن وغیرہ کا  
لمہ ہے۔ لیکن میاں۔۔۔۔۔ شکل سے تو تم پڑھے لکھے لگتے ہو۔۔۔۔۔ بھلا تمہارے لائق  
ن کیا کام ہو سکتا ہے۔ کتنا پڑھے ہو۔“

کبھی کبھی انسان کی اعلیٰ تعلیم بھی اس کی راہ کی رکاوٹ بن جاتی ہے۔ لوگ آپ سے  
ددی تو رکھتے ہیں لیکن آپ کو کوئی کام دیتے ہوئے شرماتے ہیں۔ میں پہلے ہی فیصلہ کر  
لیا تھا کہ میں اپنی تعلیم اور خاندانی پس منظر کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔  
”جی بس گزارہ کر لیتا ہوں۔ آپ مجھے کسی بھی کام پر رکھ سکتے ہیں، میں بہت اُمید  
ار آپ کے پاس آیا ہوں۔“

صدیقی صاحب نے ایک بار پھر مجھے غور سے دیکھا جیسے پڑھائی والی بات پر انہیں  
نہ آ یا ہو۔ لیکن وہ جہاں دیدہ آدمی تھے انہوں نے اس بات پر دوبارہ کوئی بحث نہیں کی۔  
”سامان اٹھا لو گے۔“

”جی ضرور۔“

انہوں نے میز پر پڑی ہاتھ سے بننے والی پرانی سی گھنٹی پر ہتھیلی ماری۔ جھک کی آواز  
پڑتی ہی چپڑا اسی حکم کے غلام جن کی طرح نمودار ہو گیا۔ صدیقی صاحب نے اسے حکم

”غفورے کو بلاؤ۔“

ویسے ہی رات سے بہت چڑھا ہوا تھا۔ اور میں جانتا تھا کہ آج حویلی کے نوکروں کی شامت  
آئی ہوگی۔ شاکر روتا ہوا واپس پلٹ گیا۔

سڑک پر کچھ دُور چلنے کے بعد مجھے پھر ایک تانگہ مل گیا۔ میں نے تانگے والے کو  
ریلوے اسٹیشن چلنے کے لیے کہا۔ مجھے یاد پڑتا تھا کہ کامران کے ایک دُور کے رشتے دار  
ریلوے میں اسٹیشن ماسٹر تھے۔ شاید جاوید صدیقی نام تھا۔ وہ مجھے نہیں جانتے تھے لیکن میں  
نے کامران سے ان کا بارہا ذکر سنا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اب تو کوئٹہ ریلوے اسٹیشن پر ہی  
تعینات ہوں؟۔۔۔۔۔ زندگی کی گاڑی کھینچنے کے لیے مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ اور پھر  
مولوی علیم صاحب کا ایک جملہ میرے کانوں میں جیسے اٹک کر ہی رہ گیا تھا۔

اس دن جب میں ان سے گیٹ پر معافی مانگ رہا تھا اور ان سے کہہ رہا تھا کہ وہ  
میرے گھر والوں کی زیادتی کی جو سزا چاہیں مجھے دے دیں۔ تو اس دن شاید انجانے میں ہی  
سہی، لیکن ان کے منہ سے ایک بہت بڑا سچ نکل گیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا۔

”تمہاری اپنی شناخت ہی کیا ہے؟۔۔۔۔۔ معافی مانگنے اور معاف کیے جانے کا حق  
صرف انہیں ہوتا ہے جو خود اپنی کوئی شناخت رکھتے ہیں۔ تم تو خود ان کے محتاج ہو جنہوں نے  
آج میری سفید پوشی پر اور میری معصوم بچیوں پر کچڑا چھالا ہے۔“

جاتے جاتے وہ یہ کیسا طمانچہ مار گئے تھے میرے منہ پر۔ واقعی سچ ہی تو تھا۔ میں تو خود  
ان لوگوں کے ٹکڑوں پر پل رہا تھا۔ میں بھلا کس بل بوتے پر ان سب کی طرف سے معافی  
مانگ رہا تھا۔ گویا اتنی زندگی میں نے بنا کسی شناخت کے ہی کاٹ دی تھی۔ صرف کشنراجم  
رضا کا بیٹا بن کر۔ میری معاشرے میں جو عزت تھی، وقار تھا وہ سب کسی اور کی دین تھا؟ لیکن  
اب میں نے خود اپنی شناخت بنانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ میں اب مولوی علیم کا سامنا تب ہی کرنا  
چاہتا تھا جب میرے پاس حماد رضا کے پاس اپنی کوئی شناخت ہوتی۔

اسٹیشن پر پہنچ کر میں نے جاوید صدیقی صاحب کا پوچھا۔ خوش قسمتی سے وہ ابھی تک  
بہیں تعینات تھے۔ میں اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کے باہر کھڑا ان کے چپڑا اسی کے باہر آنے کا  
نظارہ کر رہا تھا جو اندر میرے نام کی چٹ لے کر گیا تھا۔ کچھ دیر میں مجھے اندر بلوایا گیا۔  
جاوید صدیقی صاحب پچاس کے پیٹے میں ایک بھرے بدن اور درمیانی قد کے معزز سے



چیز اسی سر ہلا کر باہر چلا گیا۔ اور چند لمحوں میں ہی ایک مضبوط بدن والے پکی عمر کے شخص کے ساتھ واپس آ گیا۔ جو قلیوں کے لباس میں ملبوس تھا۔ کاندھے پر سی، سُرخ قمیض اور ہاتھ پر لوہے کا پٹا (بج)۔۔۔۔ اس نے کمرے میں گھسنے سے پہلے بیڑی بچھا دی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ صدیقی صاحب کی بہت عزت کرتا تھا۔ غفور اندر آ کر سلام کر کے کھڑا ہو گیا۔

صدیقی صاحب نے پھر سر اٹھایا۔

”ہاں بھئی غفور۔۔۔ تمہاری نفری پوری ہوئی یا نہیں۔“

”کدھر صاحب جی۔۔۔ وہ سلو کا بیٹا جسے پچھلے مہینے نمونیا ہو گیا تھا۔ اس نے ابھی تک ڈیوٹی پر رپورٹ نہیں کی ہے۔ دو ایک اور بھی ہیں حرام خور، جو مفت کی چھٹیاں کرتے رہتے ہیں۔ میں نے کاغذ بنالیا ہے، کل آپ کو کمپلیٹ مل جائے گی۔“

معلوم ہوا کہ غفور اسٹیشن پر موجود ڈرائی پورٹ کا لیبر انچارج تھا۔ صدیقی صاحب نے مجھے اسی کے ساتھ عارضی طور پر لگانے کا فیصلہ کیا تھا۔ کیونکہ مستقل قلی بننے کے لیے محکمے سے باقاعدہ اجازت نامہ لینا پڑتا تھا اور یہ لبا کام تھا۔ البتہ یہ صدیقی صاحب کے اختیار میں تھا کہ وہ روز کی اجرت پر عارضی طور پر رکھے جانے والے مزدوروں یا قلیوں میں میرا نام ڈلوا دیتے۔

”غفور۔۔۔ یہ حماد ہے۔۔۔ آج سے یہ نو جوان تمہارے انڈر کام کرے گا۔ فی الحال عارضی ہے۔ کام دیکھ کر فیصلہ کریں گے کہ پکا پرمٹ جاری کریں یا نہیں۔“

غفور نے حیرت سے سر سے پیر تک میرا جائزہ لیا۔ جانے میرے چہرے پر ایسی کون سی تحریر تھی کہ ان میں سے کوئی بھی مجھے مزدور تسلیم کرنے پر ذہنی طور پر رضا مند ہی نہیں ہو پارہا تھا۔ پہلے صدیقی صاحب اور اب یہ غفور۔ شاید عمر بھر کی خوش حالی از خود ہمارے چہرے پر ایک خاص تحریر اور ایک خاص چمک پیدا کر دیتی ہے۔ لگتا تھا یہ تحریر مٹتے مٹتے مٹے گی اور یہ چمک جاتے جاتے جائے گی۔

صدیقی صاحب نے جاتے جاتے مجھ سے کہا کہ کسی بھی وقت کوئی بھی مسئلہ درپیش ہو تو میں ان کے پاس آ سکتا ہوں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میرے پاس رہنے کا فی الحال کوئی

گھر نہ تھا۔ اور میں اکیلا ہوں۔ صدیقی صاحب نے غفور سے کہا کہ وہ تھرڈ کلاس والے ویٹنگ روم کے چیر اسیوں کو میرے بارے میں بتا دے کہ میں رات وہیں بسر کیا کروں گا فی الحال۔ ویسے تو اس وقت گرمیوں کا موسم تھا اور رات پلیٹ فارم پر بھی گزاری جا سکتی تھی۔ غفور نے سب سے پہلے میری وردی گودام سے نکلوا کر میرے حوالے کر دی۔ مجھے میری نئی شناخت کا پہلا نمبر بھی الاٹ کر دیا گیا۔ میری پہلی شناخت، حماد۔۔۔۔۔ مزدور نمبر 137۔ بلکہ یہاں تو مزدوروں کو ان کے نام سے نہیں بلکہ ان کے نمبروں سے ہی پکارا جاتا تھا۔ میں بھی اب حماد نہ تھا۔ صرف ایک نمبر تھا۔ مزدور نمبر 137۔۔۔۔۔ بلکہ یہ تو اچھا ہی تھا۔ میرا نام بھی ان مزدوروں کے ناموں میں کسی بھی طرح نہیں جتا تھا۔ اگر شناختی کارڈ کی نقل ریکارڈ میں جمع کر دینے کی شرط نہ ہوتی تو شاید میں اپنا نام بھی بدل ہی لیتا۔

ہر ریلوے اسٹیشن کی اپنی ایک الگ ہی دنیا ہوتی ہے۔ الگ ہی صبح شام ہوتے ہیں۔ میں آج تک ہوائی جہاز سے ہی سفر کرتا چلا آیا تھا۔ میرا ٹرین کے سفر کا تجربہ صرف لندن اور یورپ کی ٹرینوں کا تھا۔ اپنے ملک میں تو میں نے کبھی ٹھیک سے کوئی ریلوے اسٹیشن بھی نہیں دیکھا تھا۔ اور تقدیر کا یہ کیسا پھیر تھا کہ میں آج اپنے ہی شہر کے ریلوے اسٹیشن پر مزدور بنا کھڑا تھا۔

ڈرائی پورٹ کے قلیوں کو عام قلیوں کی طرح مسافر ٹرینوں سے زیادہ واسطہ نہ تھا۔ انہیں زیادہ تر مال گاڑی سے مال اتارنا ہوتا تھا۔ اس دن بھی کچھ دیر پہلے ہی پلیٹ فارم نمبر 2 پر مال گاڑی آ کر لگی تھی۔ غفور نے تمام جزئیات طے ہو جانے کے بعد میری کمر تھکی۔

”چل بھئی جوان۔۔۔۔۔ لگ جا اپنی مزدوری پر۔ رب بھلی کرے گا۔ میں بھی دیگر مزدوروں کے ایک گروہ کے ساتھ سامان ڈھونے پر لگ گیا۔ اس دن مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ بوجھ کسے کہتے ہیں، اور صحیح معنوں میں بوجھ اٹھانے والے کا جسم کس طرح چٹختا ہے۔ میں ادھیروں میں ہی ہلکان ہو گیا۔ غفور مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے مجھے اپنے قریب بلایا اور ہنس کر کہنے لگا۔

”کیوں بھئی جوان۔۔۔۔۔ لگتا ہے زندگی میں پہلے کبھی بوجھ نہیں اٹھایا۔“

”نہیں مجھے عادت نہیں ہے۔ لیکن تم فکر نہ کرو۔۔۔۔۔ میں اپنے حصے کا کام پورا کروں



گیا۔“ غفور نے میرے ہاتھ پکڑ لیے اور میری ہتھیلیوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔  
 ”اویار غفور سے کی نظر کبھی جھوٹ نہیں بول سکتی۔ یہ تو قلم کا غڈ پکڑنے والے ہاتھ ہیں۔  
 یہ تو کہاں آگیا ہے اپنی جوانی جلانے کے لیے میری جان۔ جا چلا جا، یہاں سے۔ ورنہ ہماری  
 طرح ایک دن تیری زندگی بھی یہ بوجھ ڈھوتے ڈھوتے گل سڑ جائے گی۔ اپنی اس خوبصورت  
 جوانی پر رحم کھا۔“

میں نے مسکرا کر غفور سے اپنے ہاتھ چھڑا لیے اور پھر بے کام پر لگ گیا۔ اُس بے  
 چارے کو کیا پتہ تھا کہ جوانی تو اس زہرہ جیس کی پہلی جھلک کی چنگاری سے ہی جل کر خاک ہو  
 چکی تھی۔ اب تو صرف سینے سے اس آگ کی نشانی کے طور پر ہلکا سا دھواں اٹھتا باقی تھا۔  
 جس دن راکھ پوری طرح بجھ گئی اُس دن سینے سے یہ اٹھتا دھواں بھی ختم ہو جائے گا۔

〇〇

## نیند

اُس رات کلاس میں بلیک بورڈ پر نعرے لکھنے والے واقعے کے بعد میں بہت دیر تک  
 بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ جانے نیند کو آنکھیں بند ہونے کے ساتھ ہی کیوں متصل کر دیا گیا  
 ہے۔ انسان آنکھیں بند کر کے بھی تو ساری عمر جاگ سکتا ہے۔ میں تو ایسے کئی لوگوں کو بھی  
 جانتا ہوں جو کھلی آنکھوں سے تمام عمر نیند میں ہی ڈوبے رہے ہیں۔ شاید ہم جسے نیند سمجھتے ہیں  
 وہ اصل میں نیند ہے ہی نہیں۔ نیند کا تعلق تو سکون سے ہوتا ہے۔ پلکیں بند کر لینے سے نہیں۔  
 میں بھی جانے کتنی صدیوں سے صرف پلکیں ہی بند کر پار ہا تھا۔ نیند تو جانے کب سے مجھ  
 سے روٹھی ہوئی تھی۔

اگلے دن صبح کامران نے مجھے یونیورسٹی ڈراپ کیا۔ اتفاق سے پارکنگ میں رکتے  
 وقت سارہ بھی اپنی سفید بیٹل کار میں سے اترتی دکھائی دی۔ کامران کی ساری توجہ اسی کی  
 طرف تھی۔ نیلے اسکرٹ میں اور اوپر بند گلے کی سفید سویٹر میں واقعی اس کا حسن قیامت ڈھا  
 رہا تھا۔ کامران کے منہ سے سیٹی سی نکلی۔

”یار میڈی۔۔۔ تم نے بتایا ہی نہیں کہ تمہاری یونیورسٹی میں ایسی ایسی حوریں بھی  
 ہنسنے آتی ہیں۔ تمہارا اگلا میسٹر کب سے شروع ہو رہا ہے یار مجھے آج اپنی جاہلیت کا حد  
 درجہ احساس ہو رہا ہے۔“

”زیادہ آہیں بھرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بقول تمہارے یہ وہی یہودن ہے جو میری  
 ہان کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ اس لیے اس پر لٹو ہونے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اسے  
 لمبائیوں سے شدید نفرت ہے۔“

کامران نے ڈھٹائی کی انتہا کر دی اور سارہ کو ایک مشہور ہالی وڈ ایکٹریس سے ملا  
 ہما۔ یہ اس کی پرانی عادت تھی۔ وہ لوگوں کو ان کے چہرے کی مماثلت سے مشہور اداکاروں



سے ملاتا اور پھر اسی نام سے انہیں پکارتا تھا، اُس نے پھر ٹھنڈی آہ بھری۔

”کوئی بات نہیں یار۔ یہودی بھی تو اہل کتاب ہوتے ہیں۔ اور پھر مجھے تو یہ بالکل سلیمی ہائیک لگتی ہے یار۔ اتنی خوبصورت لڑکی سے دشمنی کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میں اپنی پچھلی تجویز واپس لیتا ہوں۔ اور تمہیں فوراً اس سے دوستی کرنے کا نیا مشورہ دیتا ہوں۔“

میں نے بمشکل کامران کو زبردستی وہاں سے واپس بھیجا۔ سارہ بھی گاڑی سے اترتے ہی کسی طالب علم کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئی تھی۔ کامران نے حتی الامکان گاڑی اس کے بہت قریب سے گزاری جس کا سارہ نے کچھ خاص نوٹس نہیں لیا۔ میں اپنا بیگ سنبھالے آگے بڑھ ہی رہا تھا کہ سارہ نے مجھے آواز دی۔

”مسٹر حماد۔۔۔ ایک منٹ پلیز۔۔۔“

میرے بڑھتے قدم رُک گئے۔ سارہ جلدی سے اپنے ہوا میں لہراتے کھلے بالوں کو سنبھالتی ہوئی میری طرف چلی آئی۔ ”ربیکا نے مجھے تمہارا پیغام دے دیا تھا۔ میں نے آج تک زندگی میں کبھی کسی کو کوئی وضاحت پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ لیکن کبھی اپنے اوپر کسی دوسرے کے کیے ہوئے کا الزام بھی برداشت نہیں کیا۔ میں نے کلاس روم کے بلیک بورڈ پر وہ سب کچھ نہیں لکھا تھا۔ اور مجھے لکھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ میں اپنے خیالات کا برملا اظہار کرتی ہوں اور اس کی ہمت بھی رکھتی ہوں۔“

”تو پھر میں اس وضاحت کو کیا سمجھوں۔ کیا تم اپنے دوستوں کی طرف سے بھی دکالت پیش کر رہی ہو، ظاہر ہے یہ ان میں سے ہی کسی ایک کی حرکت ہے۔“

”نہیں میں ان میں سے بھی کسی کی دکالت پیش نہیں کر رہی ہوں، کیونکہ سچ کو دکالت کی ضرورت نہیں ہوتی۔“

”سچ کو دلیل کی ضرورت تو ہوتی ہے نا۔ اور جن کے پاس دلیل نہیں ہوتی وہی ایسی مہنگا نہ حرکتیں کر کے اپنا غصہ اپنی فرسٹریشن نکالتے ہیں۔“

سارہ نے ایک گہری نگاہ میرے اوپر ڈالی اور سرد سے لہجے میں بولی۔ ”دوسروں کا تو مجھے نہیں پتہ لیکن میرے پاس ہزاروں دلائل موجود ہیں۔ لیکن میں نے کہا نا، سچ کو ثابت کرنے کے لیے میں ان دلائل کو بیان کرنے میں اپنا اور تمہارا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی۔“

میں نے اُسے فیصلہ سنا دیا۔

”تو پھر طے رہا، ہم دونوں میں سے جس نے بھی دوسرے کو اپنے سچ سے قائل کر دیا، دوسرا اُسی کا راستہ اپنالے گا، بولو منظور ہے۔“

سارہ نے چونک کر میری طرف دیکھا اور شاید اُسے میری آنکھوں میں چھپا چیلنج بھی صاف نظر آ گیا۔

”منظور ہے، تمہیں ہر اکر مجھے واقعی بہت خوشی ہوگی۔“

”اس کا فیصلہ تو آنے والا وقت ہی کرے گا۔ بیسٹ آف لک ”Best of Luck“ میں اور سارہ مخالف سمتوں میں مڑے اور اپنے اپنے راستوں پر چل دیے۔ دُور سے کوئی ہمیں دیکھتا تو اسے یوں لگتا کہ ہم ایک ہی کمان سے چھوٹے دو مختلف تیر ہیں جنہیں دو مختلف سمتوں میں ایک ساتھ چھوڑ دیا گیا ہو۔

اس دن کلاس میں سارہ کے گینگ نے مجھ پر وقتاً فوقتاً فقرے بازی کرنے کی کوشش کی لیکن میں چپ رہا۔ ربیکا سارہ کی بہت اچھی دوست تھی لیکن جانے کیوں اس دن کے بعد سے اس نے میرے ساتھ ہی ڈیسک پر بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔ کلاس میں پڑے ہر ڈیسک پر دو طالب علموں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی اور جس دن سے میں کلاس لے رہا تھا تب سے اب تک میں اکیلا ہی بیٹھتا تھا۔ ربیکا بظاہر ہر لمحہ ہلکے گلے کرنے والی، ہمیشہ جینز جیکٹ میں ملبوس رہنے اور چیونگم چبانے والی ایک شوخ و شنگ تلی جیسی لڑکی تھی، جو چلتے وقت اپنے بوائے کٹ بالوں کو ایک خاص ادا سے جھٹکتی تو آس پاس کے نوجوانوں کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی۔ لیکن ایک آدھ دن جب وہ میرے ساتھ ڈیسک پر بیٹھی تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ پڑھائی میں بھی اتنی ہی دلچسپی رکھتی ہے جتنی دوسری شونیوں اور لائبالوں میں۔

سارہ کا گینگ لیڈر بظاہر ایک یہودی لڑکا جم تھا، اُس کے علاوہ بیٹا بھی ان کے گروپ کی سرگرم رکن تھی۔ یوں سارہ بیٹا، جم اور ڈیوڈ پر مشتمل یہ چار کا ٹولا تھا جو در پردہ سارہ ہی کی دی ہوئی ہدایات پر عمل کرتا تھا۔ پھر ایک دن بیک کے دوران جب جم نے اسٹوڈنٹس کو ہنسانے کے لیے کچھ رکاوٹوں بنائے اور چند مزاحیہ جملے لکھے تو مجھے اس کی لکھائی سے اندازہ بھی ہو گیا کہ اس دن بلیک بورڈ پر اسی کی تحریر تھی جو زہرا گل رہی تھی۔ بہر حال اس دن کے